سہ ماہی صفا کی

خصوصی پیشکش

موجودہ سماجی مسائل کا حل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی روشنی میں

ترتیب:

محمد رضوان القاسمی ○ خالد سیف اللہ رحمانی

دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد (الہند)

خطباتِ حیدرآباد

۲۰ ۱۴ھ مطابق ۱۹۹۹ء

بعنوان: سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عائلی، سماجی اور معاشرتی پہلو
کے موقع پر

سہ ماہی صفا کی خصوصی پیش کش

موجودہ سماجی مسائل کا حل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی روشنی میں

مدیر اعلیٰ: محمد رضوان القاسمی ○ مدیر مسئول بدر الحسن قاسمی ○ مدیر خالد سیف اللہ رحمانی

معاونین

سرفراز احمد قاسمی — احمد عبد المجیب قاسمی ندوی

شائع کردہ: شعبہ نشر و اشاعت دار العلوم سبیل السلام عقب صلالہ بارکس، حیدرآباد۔ الہند

مشترکہ شمارہ ۳۱-۳۲

محرم —— جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ

مطابق

اپریل ——— ستمبر ۱۹۹۹ء

زرِ تعاون :

سالانہ ۱۰۰ فی شمارہ ۳۰ موجودہ خصوصی شمارہ ۱۰۰

صفا کی توسیعِ اشاعت

آپ کا اس میں حصہ لینے کا مطلب

- ☆ اردو کے گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کرنا ہے
- ☆ علومِ نبوت اور دینی دعوت کو عام کرنا ہے
- ☆ تعمیری اور اصلاحی پیغام کو ہر دَر اور ہر گھر تک پہنچانا ہے
- ☆ جدید دنیا کے جدید مسائل سے واقفیت حاصل کرنا ہے
- ☆ کلمہ کی اساس اور بنیاد پر اپنے جذبۂ اخوت کو پروان چڑھانا ہے اور ملی شناخت کی عظمت کو پہچاننا ہے
- ☆ شہری زندگی کے اصول اور آداب کو جاننا ہے

امید ہے کہ آپ اپنا یہ حصہ پوری دردمندی اور فکر مندی کیساتھ ادا فرمائیں گے

امتحاں ہے تیرے ایثار کا خودداری کا

فہرست

نامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی مدظلہ جہاں ایک صاحبِ ذوق انشاء پرداز، منفرد نثر نگار، زبان وادب کے رمز شناس ہیں اور علومِ اسلامی پر گہری نگاہ کے حامل ہیں، وہیں شعر و سخن کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ مولانا موصوف نے درجِ ذیل نعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ مبارک "محمد" کے پانچوں حروف "م، ح، م، م اور د" کی مناسبت سے یہ پانچ اشعار کہے ہیں: حرفی رعایت سے مولانا موصوف نے اپنی دقیقہ سنجی اور فکرِ رسا سے معانی کی وہ عظیم اور دلکش دنیا سجائی ہے، جو دل اور نگاہ دونوں کو بیک وقت اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ (ادارہ)

لاریب کہ ہے نورِ خدا نامِ محمدؐ
ناموسِ وفا، صدق و صفا نامِ محمدؐ

ہے "م" سے محبوبیِ عالم کا اشارہ
آنکھوں کی ضیاء، دل کی جلا نامِ محمدؐ

"ح" سے ہے حیاتِ ابدی جاں بہ لبوں کی
جان آگئی تن میں، جو لیا نامِ محمدؐ

ہے "م" مکرر سے عیاں مہرِ نبوت
مصدر ہے محبت کا سدا نامِ محمدؐ

ہے "د" دلیلِ کرم و لطف و عنایت
داروئے شفا، دل کی دوا نامِ محمدؐ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ

خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مؤمن و مسلم کے تعلق کی جو بنیادیں ہونی چاہئیں، ان پر اصولی حیثیت سے غور کیا جائے تو سورۂ اعراف کی ۱۵۷ویں آیت اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: (ترجمہ) ”پس جو لوگ ان پر (یعنی نبیؐ پر) ایمان لے آئے اور ان کی تعظیم اور ان کی مدد کی اور اس نورِ (ہدایت، قرآن و سنت) کی اتباع کی، جو اس (ہمہ تن نور) کے ساتھ اترا تھا، یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔“ (الاعراف: ۱۵۷)

اس آیتِ کریمہ سے واضح ہے کہ نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کی چار بنیادیں ہیں: (۱) ایمان (۲) محبت اور تعظیم و تکریم (۳) نصرت اور مدد (۴) اطاعت اور اتباع۔

(۱) ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اس بات پر یقین و اعتماد رکھنا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیاء آئے، سب اللہ کی طرف سے بھیجے گئے تھے، یہ انبیاء اپنے اپنے دور اور اپنے زمانہ میں خدائی احکام و ہدایات خدا کے بندوں کو پہنچاتے رہے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی ان تمام نبیوں اور رسولوں کے سردار پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو کسی خاص زمانہ، کسی خاص علاقہ اور کسی خاص قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ اللہ کا ابدی دین اسلام لے کر تمام دنیا اور پوری کائنات کی طرف مبعوث ہوئے اور تا قیامت انہی کی نبوت اور انہی کی شریعت جاری و نافذ رہے گی۔ اس حقیقت کو قرآن نے آپؐ کی زبان سے اس طرح جاری کرایا:

”اے لوگو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف۔“ (الاعراف: ۱۵۸)

(۲) نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف خشک ایمان کافی نہیں ہے، جب تک کہ اس میں محبت اور تعظیم و تکریم کا پہلو نہ ہو۔ اس سے ایمان میں حلاوت اور مٹھاس پیدا ہوتی ہے، گھلاوٹ اور رچاؤ آتا ہے، لطف دوبالا ہوتا ہے، لذت اپنی بہارِ جاں فزا دکھاتی ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (کامل) مؤمن نہیں بن سکتا جب تک کہ میں اس کو اس کے باپ (ماں)، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ (بخاری و مسلم) حضرت انسؓ ہی کی بیان کردہ یہ حدیث بھی ہے کہ جس شخص میں یہ تین چیزیں ہوں گی، وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حقیقی لذت سے لطف اندوز ہوگا، اوّل یہ کہ اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ ہو،

دوسرے یہ کہ کسی بندہ سے اس کی محبت محض اللہ (کی خوشنودی) کے لیے ہو، تیسرے یہ کہ جب اسے اللہ نے کفر کے اندھیرے سے نکال کر ایمان واسلام کی روشنی سے نواز دیا تو اب وہ اسلام سے پھر جانے کو اتنا ہی برا جانے جتنا آگ میں ڈالے جانے کو۔ (بخاری ومسلم)

محبت کی یہی وہ اندرونی کیفیت ہے جو انسان کو ظاہری تعظیم وتکریم کی طرف لاتی ہے۔ اسی لیے قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے اور آپؐ سے محبت کرنے والوں کے لیے یہ ہدایت دی ہیں:

"اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول سے کسی کام میں سبقت (پیش قدمی) مت کیا کرو۔"
(الحجرات :۱)

"اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں کھل کر بولا کرتے ہو، کہ تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔"
(الحجرات :۲)

"بے شک جو لوگ اپنی آواز رسول کے سامنے پست رکھتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے قلوب اللہ نے تقویٰ کے لیے خالص کر دیا ہے، ان لوگوں کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔"
(الحجرات :۳)

"تم لوگ رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا تم میں سے ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے، (کہ جی چاہا آئے نہ جی چاہا نہ آئے، بلکہ رسول کا بلانا ایک حاکمانہ حیثیت رکھتا ہے، اجابت واجب ہے۔)"
(النور :۶۳)

"مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین باوجودیکہ ہر وقت، ہر حال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شریکِ کار رہتے تھے اور ایسی حالت میں احترام وتعظیم کے آداب ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن ان کا یہ حال تھا کہ آیتِ مذکورہ کے نازل ہونے کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ عرض کرتے تو اس طرح بولتے تھے جیسے کوئی پوشیدہ بات کو آہستہ کہا کرتا ہے، یہی حال حضرت فاروق اعظمؓ کا تھا۔" (شفاء)

حضرت عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی مجھے دنیا میں محبوب نہ تھا اور میرا یہ حال تھا کہ میں آپؐ کی طرف نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا اور اگر کوئی مجھ سے آپ کا حلیہ مبارک دریافت کرے تو میں بیان کرنے پر اس لیے قادر نہیں کہ میں نے کبھی آپؐ کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں۔

ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ مجلس صحابہؓ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تھے تو سب نیچی نظریں کر کے بیٹھتے تھے، صرف صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ آپؐ کی طرف نظر کرتے اور آپؐ ان کی طرف نظر فرما کر تبسم فرماتے تھے۔

عروہ بن مسعود کو اہل مکہ نے جاسوس بنا کر مسلمانوں کا حال معلوم کرنے کے لیے مدینہ بھیجا، اس نے صحابہ کرامؓ کو پروانہ وار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر گرتا اور فدا ہوتا ہوا دیکھ کر واپسی میں یہ رپورٹ دی کہ میں نے کسریٰ و قیصر کے دربار بھی دیکھے ہیں اور ملک نجاشی سے بھی ملا ہوں، مگر جو حال میں نے اصحابِ محمدؐ کا دیکھا وہ کہیں نہیں دیکھا، میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگ ان کے مقابلہ میں ہرگز کامیاب نہ ہوگے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث میں ہے کہ جب آپؐ گھر میں تشریف فرما ہوتے تھے تو صحابہ کرامؓ باہر سے آواز دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ کو بلانا بے ادبی سمجھتے تھے، دروازہ پر دستک بھی صرف ناخن سے دیتے تھے، تاکہ زیادہ کھڑکا اور شور نہ ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی صحابہؓ و تابعین کا معمول یہ تھا کہ مسجد نبویؐ میں کبھی بلند آواز سے بات کرنا تو درکنار کوئی وعظ و تقریر بھی زیادہ بلند آواز سے پسند نہ کرتے تھے، اکثر حضرات کا عالم یہ تھا کہ جب کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لیا تو رونے لگے اور ہیبت زدہ ہوگئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپؐ کے ساتھ تعظیم و تکریم کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی کو آپؐ کے روضۂ اطہر پر حاضر ہونے کی سعادت مل رہی ہو تو وہاں بھی صلوٰۃ و سلام کے وقت نگاہیں نیچی ہوں اور آواز پست ہو، آپؐ کا اسم گرامی آئے تو "صلی اللہ علیہ وسلم" کے ذریعہ نذرانۂ عقیدت و محبت پیش کیا جائے، آپؐ کی حدیثیں بیان کی جارہی ہوں تو انہیں توجہ اور ادب سے سنا جائے، آپؐ کی شان میں ادنیٰ درجہ کی گستاخی کو نہ روا رکھا جائے اور نہ برداشت کیا جائے، مختصر یہ کہ بعدِ وفات اس طرح کے جس قدر تعظیمی اور تکریمی تقاضے ہوسکتے ہیں، ان سب کی تکمیل کی جائے؛ آپؐ کے عطا کردہ نظام حیات کی اہمیت کو محسوس کرنا اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا بھی آپؐ کی تعظیم و تکریم کا ہی پہلو ہے۔

(۳) احترام اور تعظیم و تکریم کے ساتھ لازمی طور پر جو چیز تیسرے نمبر پر سامنے آتی ہے، وہ ہے نصرت اور تعاون، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاملہ نصرت اور تعاون کا ہو۔ یہ معاملہ اتنا اہم ترین ہے کہ سورۂ آلِ عمران آیت ۸۱ سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاءِ کرام علیہم

الصلوٰۃ والسلام سے یہ عہد لیا کہ نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ جب بھی آئے، تاہم وہ اپنے زمانہ میں اپنی امت سے ان کی تائید و نصرت کی وصیت ضرور کریں۔ یہی وجہ ہے کہ تورات و انجیل میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے فضائل و صفات اور علامات کی تفصیلات ملتی ہیں، جس پر علماء نے مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ زمانۂ نبوت میں تائید و نصرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ متعلق تھی، آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی شریعت اور آپؐ کے دین کی تائید و نصرت ہی آپؐ کی تائید و نصرت کا مصداق ہے۔ اس لیے اگر آج کے زمانہ میں کوئی شخص آپؐ کے پیش کردہ دین اور لائی ہوئی شریعت کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہے، آپؐ کی حیاتِ طیبہ اور پاکیزہ زندگی پر کتابیں لکھتا ہے اور مختلف انداز سے آپؐ کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کو عام کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو یہ سب نصرت میں شامل ہے اور ایسی نصرت دراصل اپنے ساتھ ہی نصرت کی شکل ہے؛ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ”اگر تم اللہ کے دین کی مدد و نصرت کرتے رہو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔“ (محمد : ۷)

(۴) نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کی چوتھی بنیاد اطاعت اور اتباع ہے۔ طاعت کا تعلق فرائض و واجبات سے ہے اور اتباع کا تعلق مندوبات و مستحبات سے ہے، یعنی ایک مؤمن آپؐ سے تعلق کی بنیاد پر صرف یہ نہیں کرتا ہے کہ جو چیزیں ضروری ہیں، انہیں کو بجالاتا ہے، بلکہ وہ آپؐ کی ایک ایک سنت کو نگاہ میں رکھ کر اس پر عمل کرتا ہے، خواہ اس سنت کی حیثیت آئینی اور اصطلاحی اعتبار سے واجب کی ہو یا غیر واجب کی۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے: ”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔“ (النساء : ۵۹)، دوسری جگہ ہے: ”(اے نبی!) آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔“ (آلِ عمران : ۳۱) یعنی آپؐ جامع کمالاتِ انسانی بنا کر بھیجے گئے ہیں اور آپ کی زندگی ساری کائناتِ انسانی کے لیے ہر شعبہ میں معیار اور نمونہ ہے، اس لیے آپ کی اتباع اور پیروی کر کے دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی لیے سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ بالا آیت : ۱۵۷ کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ”یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔“

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کی یہ چار اہم بنیادیں ہیں۔ ان بنیادوں پر حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپؐ سے جو تعلق پیدا فرمایا تھا، اس کی تاریخ انسانی میں نظیر نہیں ملتی۔ یہی نظیر ہمارے نظروں کے سامنے رہنی چاہیے؛ اسی وقت ہم دنیا کی قوموں کے درمیان بے نظیر بن سکتے ہیں، نہ صرف یہ بلکہ قوموں کی امامت کے اپنے فریضہ کو بھی انجام دے سکتے ہیں۔

اسی بنیادی حقیقت اور پس منظر میں "دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد" نے پہلی دفعہ حیدر آباد میں "خطباتِ حیدر آباد" (یعنی خطباتِ سیرت) کا اہتمام کیا ہے۔ یہاں اس کی وضاحت مناسب معلوم ہو رہی ہے کہ "دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد" ہمیشہ تعلیم و تدریس کے علاوہ امت کی عمومی دعوت و اصلاح کو بھی اپنی محنتوں اور کاوشوں کا مرکزِ توجہ بنایا ہے اور وقت کے اہم ترین مسائل پر سمینار اور اجتماعات منعقد کیے ہیں۔ علم و تحقیق اور دعوت و تذکیر کا ایک اہم ذریعہ خطبات ہیں۔ حالیہ عرصہ میں مختلف علمی موضوعات پر "توسیعی خطبات" کا سلسلہ اگرچہ یورپ کی دانش گاہوں نے شروع کیا ہے، اور بجاطور پر یہ علمی موضوعات پر زیادہ سے زیادہ معلومات کو یکجا و مرتب طریقہ پر فراہم کرنے کا ایک مفید ذریعہ ہے؛ تاہم مسلم سلاطین کے دور میں اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔

اسی پس منظر میں ہندوستان میں بھی علمی و فکری موضوعات پر خطبات کا سلسلہ شروع ہوا اور ۱۹۲۵ء میں مدراس میں "اسلامی تعلیمی انجمن مدراس" کی دعوت پر سیرتِ نبوی کے موضوع پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے آٹھ تاریخی خطبات دیئے۔ ان خطبات نے سیرتِ طیبہ پر غور و فکر اور بحث و تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھولا اور ان خطبات کو ایسا قبولِ عام اور دوام حاصل ہوا جو کسی اور خطبہ کے حصہ میں نہیں آیا۔ پھر معروف ادیب اور مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے "مشکلات القرآن" کے موضوع پر بصیرت افروز خطبات دیئے۔ چند سال قبل اسلامیہ یونیورسٹی بھاول پور کی دعوت پر مشہور محقق اور صاحبِ نظر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (سابق مقیم پیرس و حال مقیم امریکہ) نے علومِ اسلامیہ کے موضوع پر نہایت فاضلانہ بارہ خطبات دیئے، جو خطبات کی تاریخ میں ایک اہم اور قیمتی اضافہ ہے۔

ماضی قریب میں ہندوستان میں بھی پھر یہ خوشگوار سلسلہ شروع ہوا اور بنگلور کے مسلمانوں نے اس میں شرفِ سبقت حاصل کیا؛ جہاں سیرت کے موضوع پر اب تک تین خطبات ہو چکے ہیں۔ حیدر آباد علم و ادب کی سرزمین ہے، ایک عرصہ سے راقم الحروف کا خیال تھا اور حیدر آباد کے اہل ذوق کا بھی تقاضا تھا کہ سیرتِ نبوی ﷺ کی نسبت سے خطبات کا اہتمام کیا جائے؛ چنانچہ دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد نے اس سال سے "خطباتِ حیدر آباد" کے نام سے سیرت کے موضوع پر توسیعی خطبات کا سلسلہ شروع کیا ہے اور پہلے خطبات کے لیے ممتاز عالم و محقق اور عربی و اردو کے معروف ادیب مولانا ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی مدظلہ (معتمدِ تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و سابق استاذ جامعہ امّ القریٰ مکہ مکرمہ) کو دعوت دی گئی ہے، جو کئی عالمی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اعزازی مشیر ہیں، نیز اردو، عربی اور انگریزی میں متعدد وقیع کتابوں کے مصنف ہیں۔

مغربی تہذیب کے غلبہ اور اسلامی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے خاندانی نظام بکھرتا جارہا

ہے، طلاق کے واقعات میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے، نئی نسل پر خاندان کے بزرگوں کی گرفت کمزور ہوتی جارہی ہے، تعلیم گاہوں اور دانش گاہوں میں بھی منشیات کا استعمال عام ہو گیا ہے، خود کشی کے واقعات بکثرت پیش آرہے ہیں، غرض مغربی تہذیب کی تیز رفتار یلغار اور ام الفواحش ٹی وی کے غلبہ اور رواج نے اخلاقی قدروں کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ اسی پس منظر میں سیرتِ نبویؐ کے عائلی، سماجی اور معاشرتی پہلو پر یہ خطبات رکھے گئے ہیں۔ جس وقت "صفا" کا یہ شمار قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا، خطبات کا سلسلہ چل رہا ہوگا، یا اس کی آخری نشست ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو کامیاب اور نافع بنائے اور یہ خطبات موجودہ سماجی حالات کے اصلاح میں مؤثر کردار ادا کر سکیں۔

☆☆☆☆☆

انہیں خطبات کے پس منظر میں "صفا" کا یہ خصوصی شمار مرتب کیا گیا ہے؛ جس میں سیرتِ نبویؐ کے سماجی اور معاشرتی پہلو پر اہم مضامین شریکِ اشاعت کیے گئے ہیں۔ بعض گراں قدر اور وقیع مضامین ایسے بھی ہیں جن میں سیرت کے عمومی پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ امید کہ "صفا" کا یہ خصوصی شمارہ "فقہِ اسلامی" اور "ادبِ اسلامی" کے خصوصی شماروں کی طرح عام وخاص دونوں حلقوں میں شرفِ قبول حاصل کرے گا اور کیا عجب کہ نسبتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد پر اس خصوصی شمارہ کے مرتبین اور معاونین شفاعتِ نبویؐ کے مستحق قرار پائیں۔

اقبال نے یہ بالکل بجا کہا ہے ؎

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پاگئے — عقل غیاب وجستجو، عشق حضور واضطراب
شوکتِ سنجر وسلیم، تیرے جلال کی نمود — فقر جنید وبایزید تیرا جمال بے نقاب

"خطباتِ حیدر آباد" کے انعقاد پر مخدوم ومحترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم، حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب مدظلہ نے اپنی خوشی ومسرت کا اظہار جن الفاظ میں فرمایا ہے اور دعائیں دی ہیں، یہ ہمارے لیے تقویت کا باعث بنا اور زادِ راہ بھی ثابت ہوا۔ ان کے علاوہ دیگر بزرگوں، رفیقوں اور ہمدردوں نے بھی اپنے اپنے انداز میں نیک تمناؤں کا اظہار فرمایا ہے۔ یہ سب ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

۱۸/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
مطابق ۳/جولائی ۱۹۹۹ء

محمد رضوان القاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ ربّ العالمین و الصّلوٰۃ و السّلام علی سیّد المرسلین و علی اٰلہ و صحبہ أجمعین

آج پوری دنیا میں سال گرہ منانے کا ایک رواج سا ہے، مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ رواج صحیح ہے یا غلط اور احکامِ شریعت کے نظام میں درست ہے یا نادرست؟ تاہم اگر کسی حقیقت پسند مورخ سے دریافت کیا جائے کہ انسانیت اور انسانی مجد و شرف کی سالگرہ کی تاریخ کون سی ہے؟ تو وہ ربیع الاول کے مہینے اور اس تاریخ کا نام لے گا جو پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یومِ پیدائش ہے۔ انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ بہار بر دوش اور بہار آفریں کوئی اور تاریخ نہیں ہو گی، جس نے دنیا کو علم و دانش اور عدل و انصاف کی سوغات دی ہو، شرافت اور انسانیت کے چراغ روشن کیے ہوں اور دنیا کو فکر و نظر کی ایک نئی سمت سے ہم کنار کیا ہو۔ آج ہم اسی عظیم شخصیت کی حیاتِ طیبہ اور سیرتِ مبارکہ کی نسبت سے "خطباتِ حیدر آباد" سننے جا رہے ہیں۔

آپ ﷺ کی سیرت ایک ایسا سدا بہار موضوع ہے جس کا حسن لازوال ہے اور جس کی خوشبو لافانی ہے، جس کی افادیت نہ کسی عہد اور زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ کسی خطہ و علاقہ کے ساتھ محدود ہے، جو تمام انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ نت نئی ترقیات اور اکتشافات و ایجادات میں جس قدر اضافہ ہو گا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی ضرورت بھی انسانیت کے لیے اسی قدر بڑھتی جائے گی۔ بیسویں صدی اب آخری سانس لینے کو ہے اور اس نے نہ جانے کتنی ہی سماجی و معاشرتی اخلاقی، اور تمدنی، معاشی اور سیاسی اور فکری اور نظری تبدیلیوں کو دیکھا ہے۔ انسانیت ان مسائل کے حل کی تلاش میں سر گرداں ہے، وہ کبھی اشتراکیت کی طرف لپکتی ہے، لیکن چند ہی قدم چل کر مشاہدہ کر لیتی ہے کہ اس کی حقیقت ایک سراب سے زیادہ نہیں، کبھی سرمایہ دارانہ نظام کو اپنے مسائل کا حل تصور کرتی ہے، لیکن حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ نظام بھی اس کے درد کا مداوا نہیں۔ جن لوگوں نے تنگ نظری کی عینک اتار کر حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے ان کو اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ آج انسانی مسائل کا حل "پیغامِ محمدی" کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا، کیوں کہ اس کا سرچشمہ خود ربّ کائنات کی تعلیمات و ہدایات ہیں، جو ہمارا خالق و مالک بھی ہے اور تمام کائنات کا رب اور پروردگار بھی اور اس سے بڑھ کر کوئی نہیں جو ہمارے مسائل اور ضروریات سے آگاہ ہو؛ اس لیے آج کی مصیبت زدہ اور تشنہ لب انسانیت کو جس "آبِ حیات" کی تلاش ہے، وہ چشمۂ محمدیؐ کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا۔ یہاں پہنچ کر بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ مولانا عبد الماجد دریابادیؒ جیسے

ادیب لبیب اور عظیم صاحبِ قلم کے ایک فکر انگیز مضمون کا طاقت ور اقتباس پیش کروں۔

مولانا دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں :

"سید المرسلین کا ایک لقب خاتم النبیین بھی ہے۔ ختم نبوت کے معنی بالکل واضح ہیں۔ جب ایک پیام اس قدر جامع و مکمل آچکا کہ اب اس میں کسی ترمیم و اضافہ کی گنجائش ہی نہیں باقی، تو کسی جدید پیام کا آنا سرے سے بے معنی ہو جاتا ہے، پیام کی ہمہ گیری کے معنی ہی یہ ہیں، کہ آیندہ کے لیے سلسلۂ پیامات منقطع۔ عرب کے امی کے لائے ہوئے پیام نے علی الاعلان اپنا دعویٰ ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا، کہ میں ہر امکانی ضرورتِ زندگی کے لیے مکمل ہدایت نامہ ہوں اور آج تک بڑے سے بڑا مخالف بھی اس دعویٰ کو کسی دلیل سے جنبش نہ دے سکا۔

اس قدر جامع و مکمل پیام کے لیے ضروری تھا کہ اسؐ کے لانے والے کی ذات بھی ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہو۔ اللہ کا بھیجا ہوا پیام، لکھا لکھایا، مرتب کتاب کی شکل میں بھی کسی پہاڑ یا درخت پر آسمان سے اتر سکتا تھا، لیکن حکیم مطلق کی مشیت نے پیام اور "پیامبر" دونوں کو ایک دوسرے کے لیے بطورِ لازم و ملزم قرار دیا اور دونوں کو ایک دوسرے کی تصدیق کا ضامن؛ لیکن ترتیباً پیامبر کا وجود پیام پر مقدم ہے۔ دنیا کا یہ آخری ہادی و رہنما پورے چالیس برس اپنے ہم جنسوں کے درمیان رہ لیا، جب جا کر اس پر پیامِ حق نازل ہونا شروع ہوا اور اس کے بعد تیئس سال کی مدت اور اس نے اپنے ہی جیسے انسانوں کے درمیان گذار دی۔ اس کی پاک و پاکیزہ زندگی اس وقت بھی دشمنوں کے لیے ایک کھلے ہوئے چیلنج کی طرح موجود رہی، کہ کوئی اٹھے اور اس میں عیب نکالے، کوئی بڑھے اور اس پر حرف گیری کرے، ابو جہل اور ابو لہب جیسے دشمن اٹھے اور بڑھے، لیکن اس مقدس سیرت، اس پاکیزہ زندگی اور اس پاک معاشرت میں ایک بات بھی قابل گرفت نہ پا سکے۔

محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ بنا کر نہیں بھیجے گئے، کسی دوسرے عالم کی مخلوق کی حیثیت سے نہیں اتارے گئے، حوائج بشری سے بے نیاز ہو کر نہیں مبعوث ہوئے، انسان بنا کر، بشریت کے تمام اوصاف و لوازم، تمام احتیاجوں اور ضرورتوں کے پابند بنا کر اس ظلمت کدۂ گیتی کو مطلع انوار کرنے کے لیے بھیجے گئے، شادیاں آپؐ نے کیں، ایک نہیں کئی کئی، اولادیں آپ کی متعدد ہوئیں، بعض زندہ رہیں اور بعض

نے حضورؐ کے سامنے وفات پائی، دوست بھی حضورؐ کے بہت سے تھے اور دشمن بھی تھے، مخلصین کا بھی ایک گروہ تھا اور منافقین کا بھی، عسرت کا بھی زمانہ گزرا اور خوش حالی کا بھی، لڑائیاں بھی بہت سی ہوئیں اور امن کا زمانہ بھی گزرا، محاربات میں کبھی فتح بھی ہوئی اور کبھی اس کے برعکس، خلقت کے ردّ و انکار کا بھی تجربہ فرمایا اور مقبولیت و مرجعیت کا بھی، غرض انسانی زندگی میں گرم و سرد، نشیب و فراز کے جتنے مواقع پیش آسکتے ہیں، سب سے ہو کر وہ پاک و طاہر زندگی گزری اور اس طرح بے داغ گزری، کہ آج محض اس کا مطالعہ سارے عالم کے لیے ایک مستقل درس بن سکتا ہے۔

حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کی یہ جامعیت صرف اس لیے تھی، کہ ہر فردِ بشر اس نمونہ کو اپنے پیش نظر رکھے اور جہاں تک اس کا ظرف و بساط اجازت دے انہیں قدموں کے نقش پر چلے۔ گلستانِ دَہر میں بار بار روح پرور بہاریں آچکی ہیں، لیکن موسم ربیع کا یہ گلدستہ ایسا ہے جو ہر ملک، ہر زمانہ، ہر قوم کے مشامِ جاں کو معطر رکھے گا۔ آج دنیا کی سب سے بڑی شامت یہی ہے، کہ اس نے سب سے زیادہ کامل و مکمل نمونہ کی طرف سے قطع نظر کر لی، غیروں کا ذکر نہیں، خود ہم کلمہ گویانِ اسلام کی بدبختی یہی ہے کہ ہم نے آفتابِ ہدایت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے تئیں یا تو اندھیرے میں ڈال رکھا ہے اور یا اگر روشنی کی طلب ہے بھی تو ٹمٹماتے ہوئے چراغوں اور لالٹینوں پر قناعت ہے۔

ہم میں سے آج کتنے بدبخت مسلمان ایسے ہیں، جو خوبی و کمال کا معیار یورپ کے طور و طریق کو سمجھ رہے ہیں، قومی تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ یورپ میں اس کا رواج ہے، معاشرت کو اعلیٰ معیار پر اس لیے لانا چاہیے کہ یورپ کا طرز یہی ہے، سود خواری اس لیے بہتر ہے کہ یورپ اسی ذریعہ سے ترقی کر رہا ہے۔ یہ ہمارے دماغوں کا ایک عام طرزِ استدلال ہو گیا ہے۔ اس سے اُتر کر وہ طبقہ ہے جو مذہبی سمجھا جاتا ہے۔ ان بے چاروں کی شامت یہ ہے کہ بجائے سرکارِ رسالتؐ سے اکتسابِ فیض کرنے کے، انہوں نے ساری جستجو اور تگ و دو محض کسی عالم یا درویش تک محدود کر رکھی ہے؛ حالانکہ کوئی امتی کتنا ہی بلند پایہ ہو، ظاہر ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین مبارک کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔

اگر آج ہم اس بڑے "امین" کے نقش قدم پر چلتے ہوتے تو ہم میں خیانت و

بد دیانتی کا گزر نہ ہوتا، اگر آج ہم اس "رؤف و رحیم" کے پیرو ہوتے، تو ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی جانب سے بے اعتمادی و بدگمانی نہ ہوتی، اگر آج ہم نے اس غارِ حرا کے بیٹھنے والے کے آثارِ مبارک کو اپنا سرمۂ چشم بنایا ہوتا تو ہمارے باطن میں کسی قسم کی گندگی باقی نہ رہ جاتی، اگر آج ہم فاتح بدر کی عظمت دل سے کرنے والے ہوتے، تو مخالفین کے مقابلہ میں ہمیں شکستیں نصیب نہ ہوتیں، اگر آج ہم رحمتہ للعالمین کے پیام پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوتے، تو اپنی جیسی مخلوقات کے ساتھ ہمیں بے گانگی و مخالفت نہ ہوتی، اگر آج اپنے سچ بولنے والے اور سچ کے برتنے والے نبیؐ کے طریقہ پر ہم قائم ہوتے، تو جھوٹ کا ہماری آبادیوں میں نام و نشان ہی نہ ہوتا، اگر آج ہم کو اسمِ پاک احمدؐ کی لاج ہوتی تو اللہ کی حمد و ثنا سے ہمیں اس قدر گریز نہ ہوتا، اگر آج ہم کو اسمِ گرامی محمدؐ سے عملاً کوئی واسطہ ہوتا، تو اپنی موجودہ پستی و بدنامی سے یہ مراحل دور ہوتے۔ آج جب کہ سارے ملک میں میلادِ مبارک کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہوں گی، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان کے ساتھ ساتھ ہم اپنے خلوت خانۂ قلب میں بھی کچھ دیر کے لیے ذکرِ پیمبر و یادِ رسولؐ کی محفل گرم کریں۔"

(ذکرِ رسول صفحہ ۱۳۵ تا ۱۳۸ شائع کردہ مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار، لاہور)

اسی پس منظر میں سیرتِ طیبہ کے مبارک موضوع پر یہ خطبات رکھے جا رہے ہیں۔ ان خطبات میں خصوصیت سے رحمتِ عالم، رہبر انسانیت، سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خاندانی، عائلی، سماجی اور معاشرتی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مشینی زندگی کے موجودہ نظام نے جہاں آسانیاں فراہم کی ہیں، مشکلات میں بھی اضافہ کیا ہے اور ذہنی تفکرات بہت بڑھ گئے ہیں، خوب سے خوب تر کی طلب اور معیارِ زندگی کو زیادہ سے زیادہ اونچا کرنے کی خواہش نے ذہنی الجھاؤ اور دماغی تناؤ میں اضافہ کیا ہے، پھر یہ تمام باتیں خاندانی نظام کے استحکام پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں، نکاح پر معاشرہ کے بقاء کا مدار ہے، لیکن کامیاب نکاح کا فیصد کم ہوتا جا رہا ہے، طلاق کے واقعات میں روز افزوں ضافہ ہوتا جا رہا ہے، شوہر اور بیوی میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت کم ہوتی جا رہی ہے، حقوق الناس میں غفلت عام ہے، بچے، بوڑھے ماں باپ کو ایک بوجھ محسوس کرنے لگے ہیں، ماں باپ بچوں کی تربیت کے لیے مناسب وقت دینے سے قاصر ہیں، جوان کی شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے، نکاح اور رشتہ کے انتخاب میں بزرگوں کی رائے اور مشورہ کو جو اہمیت حاصل تھی وہ ختم ہوتی جا رہی ہے اور نوجوان نسل زندگی کے اہم مسائل میں خود رائی میں مبتلا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کی رائے میں عقل

سے زیادہ جذبات کو اور ہوش سے زیادہ وقتی جوش و خروش کو دخل ہوتا ہے اور دن رات اس کے منفی اثرات سامنے آتے رہتے ہیں۔

منشیات کی کثرت ہے، تعلیم گاہوں اور دانش گاہوں میں نت نئی نشہ آور اشیاء کا استعمال نہایت تشویش ناک سماجی مرض ہے، ایمان کی کمزوری اور ٹی وی کلچر کی وجہ سے لوگوں نے زندگی کی تلخیوں کا آسان حل خودکشی کی صورت میں دریافت کر لیا ہے اور خودکشی کے واقعات اس کثرت سے ہو رہے ہیں کہ ماضی میں اس کا تصور بھی دشوار تھا، کم عمر بچوں کی خودکشی کے واقعات بھی سامنے آرہے ہیں، معیشت اور معاشرت کا گہرا ربط ہے، اس میں شبہ نہیں کہ لوگوں کی معاشی سطح میں اضافہ ہوا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ اضافہ معاشی حرص و طمع میں ہوا ہے، اس مزاج نے اخلاق و دیانت کا جنازہ نکال دیا ہے، مالیاتی ادارے کثیر نفع کی امید دلا کر قائم ہوتے ہیں اور چند ہی دنوں میں افق سے غائب ہو جاتے ہیں، اس کی وجہ سے لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ غیر سودی طریقہ پر مالیاتی اداروں کا چلانا ممکن نہیں، مغربی تہذیب کی تیز رفتار یلغار اور امّ الفواحش ٹی وی کے غلبہ اور رواج نے تمام انسانیت کو سخت اخلاقی پستی کی حالت میں پہنچا دیا ہے، معاملات کے شرعی اصول اور صالح اخلاق کی اہمیت لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہو گئی ہے، پھر لوگوں میں اس بات کا بھی شعور نہیں کہ وہ سماج کے ان بگڑے ہوئے حالات کی کس طرح اصلاح کریں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی اور عائلی زندگی کے پہلو پر ان خطبات کا مقصد یہی ہے کہ لوگوں کو سمجھایا جاسکے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی روشنی میں ان مشکلات کا حل کیا ہے؟ کس طرح معاشرہ کی اصلاح کی جائے اور نئی نسل کی سیرت سازی کا عظیم کام ہو سکے، موجودہ مادہ پرست دنیا میں پیغامِ نبوت کی اہمیت اور تعلیم نبوی ﷺ کی ضرورت و افادیت کو لوگ سمجھ سکیں۔ امید ہے کہ یہ خطبات ان شاء اللہ ان مقاصد کے حصول میں ممد و معاون ہوں گے۔ یہ خطبات جلد ہی کتابی صورت میں طبع کیے جائیں گے اور دوسری زبانوں، خاص کر عربی و انگریزی میں ان کے ترجمے بھی کرائے جائیں گے؛ تاکہ ان کی افادیت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو اور ایک عالم کو اس سے نفع پہنچے۔

خطبات کی تاریخ بہت قدیم ہے، کہنے والوں نے تو یہ بھی کہا ہے کہ دراصل قرآن بھی خطبات ہی کا مجموعہ ہے، جس میں خود ربّ کائنات اپنے بندوں سے خطاب فرما رہے ہیں۔ قرآن سے پہلے کی مذہبی کتابوں میں بھی بکثرت انبیاء اور اہل اللہ کے خطبات منقول ہیں۔ احادیثِ نبوی کا ایک اہم حصہ "خطبات" بھی ہیں، جمعہ کے خطبات، عیدین کے خطبات، تربیتی خطبات، جہاد اور خصوصی

واقعات کے پس منظر میں دیئے جانے والے خطبات، نیز فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے موقعہ کے یادگار اور اثر انگیز خطبات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں وضاحت و تفصیل کے ساتھ موجود ہیں، جو گہری معنویت کا مظہر بھی ہیں اور ولولہ انگیز زبان و ادب کا شاہکار بھی۔

ہندوستان میں علمی اور تحقیقی خطبات کی ایک تاریخ ہے، جو مختلف انجمنوں اور دانش گاہوں کی دعوت پر دیئے گئے ہیں۔ "اسلامی تعلیمی انجمن مدراس" کی دعوت پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۵ء میں وہ تاریخی خطبہ دیا، جو "خطباتِ مدراس" کے نام سے معروف و مقبول ہے، جو سیرتِ نبویؐ کے کتب خانوں میں نہایت ہی وقیع اضافہ ہے اور نصف صدی گذر جانے کے باوجود اس کی تر و تازگی، معنویت اور اثر انگیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی انجمن کی دعوت پر مدراس میں ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبالؒ نے انگریزی زبان میں "افکارِ اسلامی کی تشکیل جدید" (The Reckons Fructiam Of Religious Thought In Islam) کے موضوع پر وہ اہم خطبہ دیا، جس نے اربابِ فکر و دانش کے حلقہ میں بڑا اثر و قبول پایا۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر اقبالؒ مدراس سے بنگلور پہنچے اور یہاں انہوں نے مذکورہ خطبات میسور یونیورسٹی بنگلور کے دعوت پر دیئے۔ ان خطبات کے بعد ڈاکٹر اقبالؒ بنگلور سے حیدر آباد ۱۴/ جنوری ۱۹۲۹ء کو پہنچے۔ جامعہ عثمانیہ کی دعوت پر انہوں نے حیدر آباد میں ۱۵/ ۱۶/ ۱۷/ جنوری کو تین دن مسلسل خطبات دیئے۔ حیدر آباد آنے سے قبل ڈاکٹر اقبالؒ نے اپنے خط بنام حمید احمد انصاری رجسٹرار جامعہ عثمانیہ مورخہ ۲۱/ دسمبر ۱۹۲۸ء خطبات کے لیے حسبِ ذیل عنوانات متعین کیے تھے۔

(۱) علم اور مذہبی تجربہ

(۲) مذہبی تجربہ کے الہامات کا فلسفیانہ امتحان

(۳) خدا کا تصور اور عبادت کا مفہوم

عبدالرؤف عروج نے اپنی کتاب "اقبال اور بزمِ اقبال حیدر آباد دکن" کے صفحہ ۳۳ پر لکھا ہے کہ حیدر آباد میں اقبالؒ نے اپنا وہ لکچر پڑھا جو وہ مدراس میں سنا چکے تھے، حیدر آباد میں اقبالؒ کے توسیعی لکچرز کے پہلے اجلاس کی صدارت مہاراجہ کشن پرشاد اور دوسرے اجلاس کی صدارت نواب امین جنگ نے کی تھی، یہ حسن اتفاق ہے کہ اقبالؒ کے یہ لکچرز ۷۰ سال قبل باغ عامہ ہی میں واقع ٹاؤن ہال (موجودہ ایوانِ مجلس مقننہ) میں منعقد ہوئے تھے، مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا تھا:

"ڈاکٹر اقبالؒ کے تعارف کی اس لیے ضرورت نہیں کہ اس ملک کا ہر کہہ و

مہہ آپ سے واقف ہے اور آپ کے کلام سے اس مجمع کا ہر فرد اپنی استعداد اور شوق کے مطابق قدر داں ہے، آپ کی ذات تعارف سے مستغنی اور آپ کا کلام ستائش سے بالاتر ہے۔ ڈاکٹر اقبالؒ کے ذکر کے ساتھ ہی ان کی تصنیفات کے انمول اور وسیع گنجینوں کا ایک لامتناہی تصور پیش نظر ہو جاتا ہے، کہ عرضِ کلام سے گذر کر جوہر بیان میں فکرِ سخن ور غلطاں و پیچاں ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اقبالؒ جس مقصدِ حیات کو اپنے علم و عمل سے پورا کر رہے ہیں، وہ انسان ترقی کی دنیا کے لیے سود مند بنانے اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج کو حاصل کرنے کا راستے بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبالؒ تصوف اور عرفان کی آغوش میں پل کر حکیم ہوئے ہیں اور ان کے حکیمانہ خطبات سے ہم سب کو یکساں مستفید ہونے کا اب بالمشافہ موقعہ ملا ہے، جس کی ہم عزت اور قدر کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اس مجمع کا ہر برنا و پیر اپنی معلومات میں قابل قدر اضافہ کرے گا۔" (شاد اقبال صفحہ ۱۲۹)

(قبال اور حیدر آباد مرتبہ شکیل احمد صفحہ ۱۸-۱۹)

ہندوستان کی تاریخ خطبات میں مشہور ادیب، مصنف اور مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے خطبات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا نے یہ خطبات مدراس میں نیو کالج کی دعوت اور ممتاز عالم مولانا عبد الوہاب بخاری کی تحریک پر ۱۹۵۸ء میں "مشکلات فی القرآن" کے عنوان سے پانچ روز دیئے تھے۔ توسیعی علمی خطبات میں "خطباتِ بھاولپور" کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ یہ مشہور محقق اور عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (سابق مقیم پیرس، حال مقیم امریکہ) کے خطبات ہیں، جو نہایت وقیع ہیں اور علمی شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ بارہ خطبات ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۸۰ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور (پاکستان) کی دعوت پر دیئے تھے۔ ماضی قریب میں شہر گلستان بنگلور میں بھی سیرت کے مقدس موضوع پر خطبات کے سلسلہ کا آغاز عمل میں آیا۔ اس سلسلہ کے پہلے خطبات ممتاز عالم دین اور فقیہ حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہ نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ نے دیئے ہیں، جو نہایت عبرت خیز اور اثرانگیز ہیں، دوسرے اور تیسرے خطبات مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد) اور مولانا سلمان حسینی ندوی (دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے دیئے ہیں۔

"خطباتِ حیدر آباد" خطبات کے اسی وقیع اور تاریخی سلسلہ کا ایک حصہ ہے، جو علم و تحقیق اور تہذیب و ثقافت کی سرزمین حیدر آباد میں شروع ہو رہا ہے۔ ان خطبات کے افتتاح کے لیے ہم لوگوں کی نظر انتخاب ممتاز عالم اور محقق اور عربی و اردو کے معروف ادیب حضرت مولانا ڈاکٹر عبد اللہ

عباس ندوی پر پڑی، جو اردو اور عربی کے علاوہ انگریزی اور فرنچ زبانوں سے بھی واقف ہیں، مختلف زبانوں میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں "تعلّم لغة القرآن" اور "مذاهب المنحرفة في التفسير" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ قرآن ہی سے متعلق آپ کی ایک اور اہم کتاب "ترجمات معاني القرآن و تطور فهمه عند الغرب" ہے، جسے رابطۂ عالم اسلامی نے شائع کر کے بڑے پیمانہ پر تقسیم کیا ہے۔ قرآن مجید کے علاوہ آپ کا اہم اور محبوب موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات اور حیاتِ طیبہ ہے۔ آپ کی نہایت اہم اور محققانہ تصنیف "عربی میں نعتیہ شاعری" ہے، جس میں نعت گوئی میں عرب شعرا کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مولانا کی اس موضوع پر ایک اور علمی کاوش "ردائے رحمت" ہے، جو عربی زبان کے دو معروف و مقبول اور مبسوط نعتیہ قصائد کا "اردو ترجمہ اور تشریح ہے۔ مولانا جامعہ امّ القریٰ مکہ مکرمہ میں پروفیسر اور رابطۂ عالم اسلامی کے انگریزی جرنل کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، ابھی بھی رابطہ کے مشیر ہیں اور جامعہ امّ القریٰ میں وقتاً فوقتاً محاضرات اور لکچرز کے لیے مدعو کیے جاتے ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسی عظیم اور بین الاقوامی درس گاہ کے معتمد تعلیمات ہیں اور علومِ اسلامی میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ آپ انگلستان سے "فلسفۂ لسانیات" میں پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ سنہ پیدائش ۱۳۴۴ھ ہے، اس طرح عمر اس وقت ۷۶ سال ہے۔ ہندوستانی نژاد (پیدائشی وطن: پھلواری شریف، پٹنہ، بہار) یہ عالم و محقق اب مکہ مکرمہ میں سعودی شہری کی حیثیت سے مقیم ہیں، مگر ترکِ وطن کے باوجود وطن نے ان کو اور انہوں نے وطن کو گلے لگائے رکھا ہے۔

حضرات! آج آپ کا یہ تاریخی اجتماع ایک تاریخی شہر میں منعقد ہو رہا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ جو اپنے زمانہ کا عابد و زاہد اور علم پرور حکمراں تھا، نے ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی اور دکنی زبان میں خدا سے دعا کی:

میرا شہر لوگاں سوں معمور کر

بادشاہ کی یہ دعا ایسی مقبول ہوئی اور اس کی زندگی ہی میں شہر ایسا شاد و آباد ہوا کہ اس نے اپنے حسنِ انتخاب پر خود داد دی اور کہا:

لطیف و دل کشا آب و ہوائے
مبارک منزلے، فرخندہ جائے

پھر اس شہر نے ہمیشہ شاعروں، ادیبوں، عالموں اور صوفیوں سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ امیر مینائی بے ساختہ کہہ اٹھے:

اللہ اللہ رے بہار چمنستاں دکن — حور پر ہے یہ جوبن نہ پری پر یہ پھبن

شاہ نصیرؔ نے جب دہلی سے حیدرآباد کے لیے رختِ سفر باندھا تو اپنے شاگرد عزیز ذوقؔ سے کہا کہ "وہ بہشت ہے بہشت، میں جاتا ہوں، چلو تم بھی چلو۔"

مولانا حالی اور داغ نے اس شہر پر اپنے جذباتِ عقیدت نثار کیے اور میر حسن نے اس شہر کے لیے خدا سے دعا کی :

سرسبز یہ شہر حیدرآباد رہے — یارب آباد حیدرآباد رہے

داغؔ دہلوی کا یہ شعر تو بہت مشہور ہے ؎

نہیں حیدرآباد پیرس سے کچھ کم — یہاں بھی سجے ہیں مکاں کیسے کیسے

منشی بشویشور پرشاد منور لکھنوی کی ایک پوری نظم "دکن" پر ہے، جس کا ایک شعر ہے ؎

حسیں صبحِ دکن ہے، حسیں شامِ دکن — جمیل فرشِ دکن ہے، جمیل بامِ دکن

یہ شہر صوفیوں کا شہر ہے، جہاں حضرت شاہ معین الدین معروف بہ حضرت شاہ خاموش نے اقامت اختیار کی، جس کو شیخ مخدوم علاء الدین انصاریؒ اور حضرات یوسفینؒ کے قیام کا شرف حاصل ہوا اور کتنے ہی صوفیاء و مشائخ ہیں جو آج بھی اس کی آغوش میں محوِ خواب ہیں۔

یہ علماء اور محققین کا شہر ہے، علم خیز اور علم پرور بھی۔ تاریخ کے ہر دور میں بالخصوص ماضی قریب میں اصحابِ تحقیق علماء کے قیام و ورود کا جو شرف اس شہر کو حاصل ہے، اس کی مثال کم ملے گی۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ، پروفیسر الیاس برنیؒ، مولانا عبدالقدیر بدایونیؒ، مولانا حافظ محمد احمد دیوبندیؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ، مولانا عبدالباری ندویؒ، مولانا عبداللہ عمادیؒ، مولانا ماہر القادریؒ اور کیسے علماء ہیں، جن کے فیضانِ علمی نے اس شہر کی علمی رونق میں اضافہ کیا اور خود اس خطہ سے مولانا انوار اللہ خاں فاروقیؒ، محدث دکن مولانا عبداللہ شاہ صاحبؒ، مولانا عبدالقدیر حسرت اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جیسے اصحابِ علم و فضل پیدا ہوئے۔ پیرس میں اسلامی دعوت کی جو عظیم شخصیت ایک عرصہ تک مقیم رہی اور ان دنوں امریکہ میں مقیم ہے۔ اس نے اسلامی دنیا میں تحقیق و تصنیف کی ایک مثال قائم کی ہے اور اس نے اس راہ میں نئے نئے چراغ جلائے ہیں، میری مراد ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے ہے، ان کا تعلق بھی اسی "بغدادِ علمی" سے ہے، مشہور زمانہ سحر انگیز خطیب اور ریاضِ رسول کا چہکتا ہوا بلبل نواب بہادر یار جنگ بھی اسی خطہ ارضی سے پوری امت کے لیے اتحاد و محبت کا پیغام اپنے خاص سُر اور لے کے ساتھ دیتے

رہے ہیں۔ اسی طرح پولیس ایکشن کے بعد ملتِ اسلامیہ حیدر آباد جس سراسیمگی سے دوچار تھی، اس حالت میں جناب سید خلیل اللہ حسینی اور چند دیگر اصحاب نے اس ملت کو جس انداز میں ہمت بندھائی اور بلند حوصلگی کا پیغام دیا، ان کا ذکر بھی اعترافِ حقیقت کے طور پر ضروری ہے۔ اس زمانہ میں ان حضرات کے پیغام کا حاصل یہ تھا ؎

ہمت جو ہو بلند تو کچھ اس سے کام لے ساقی کا انتظار نہ کر بڑھ کے جام لے
قیمت غمِ حیات کی تو دام دام لے یعنی بہار ہو کہ خزاں سب سے کام لے

اور ہاں! یہ ادیبوں اور شاعروں کا شہر ہے، جہاں اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر "محمد قلی قطب شاہ" پیدا ہوئے اور جو اردو زبان کی معلوم تاریخ کے پہلے معروف شاعر "ولی دکنی کا مسکن ہے، جہاں قطب شاہی دور میں اردو پیدا ہوئی، جس نے امجد حیدر آبادی جیسے مصلح اور مذہبی، صفی جیسے قادر الکلام، مخدوم محی الدین جیسے باغی انقلابی، شاذ تمکنت جیسے جدید لب ولہجہ کے ترجمان اور اوج یعقوبی جیسے متین اور قدیم روایات کے امین شعراء کو وجود بخشا۔

علم و ادب اور اردو زبان میں اس شہر کی خدمت کو کبھی فراموش نہ کیا جاسکے گا۔ یہیں "دار الترجمہ" قائم ہوا اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۰ء تک اس نے سائنس، فلسفہ، تاریخ وغیرہ کے معیاری لٹریچر کو اردو میں منتقل کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی دار الترجمہ نے اردو زبان میں وضع اصطلاحات کا کام کیا اور اس کے لیے پورے ملک سے منتخب علماء، ادباء مولوی ظفر علی خاں، مولوی عبد الحلیم شرر اور مولانا عبد اللہ عمادی وغیرہ سے مدد لی گئی۔

یہیں "دائرۃ المعارف العثمانیہ" کی بنیاد پڑی، جس نے علومِ اسلامی کے سینکڑوں مخطوطات کو زندگی عطا کی اور ان کو طبع کرایا۔ کنز العمال، بیہقی، مشکل الآثار، الانساب، امام محمد کی کتاب الاصل، مولانا عبد الحیٔ (پدر بزرگوار مولانا سید ابو الحسن علی ندوی) کی کتاب "نزہۃ الخواطر" اور فقہ و حدیث، تفسیر و کلام، طب و ادب، سیرت و رجال اور لغت نیز فلسفہ و تاریخ کی کتنی ہی کتابیں ہیں، جو اپنی طباعت و اشاعت اور تصحیح و تعلیق میں دائرۃ المعارف کی رہینِ منت ہیں؛ مگر افسوس کہ دار الترجمۃ کے بعد اب "دائرہ" حکومت کی بے پرواہی کا شکار ہے اور ملک کا ایک عظیم اور قیمتی ورثہ اس وقت کسی کی "نگاہِ التفات" کا منتظر ہے۔ کیا عجب کوئی ساقی اپنے ہاتھ میں "مستانہ" تھامے ہوئے آئے، جو اس علمی میخانہ کے بگڑے ہوئے دستور کو بدل دینے کا باعث بنے۔

اسی طرح اس شہر نے اپنے قیمتی، معیاری اور وسیع کتب خانوں کے ذریعہ بھی علم و ادب کی

خدمت کی ہے۔ مفتی محمد سعید خاں کا کتب خانہ سعیدیہ اپنے علمی جواہر پاروں کے لیے شہرت رکھتا ہے، کتب خانہ آصفیہ (سنٹرل لائبریری) ملک کے چند معروف کتب خانوں میں ایک ہے، اردو کتابوں کے بھی متعدد اہم کتب خانے شہر میں موجود ہیں، علوم اسلامی کے مخطوطات کی حفاظت میں بھی غالباً پٹنہ اور کلکتہ کے بعد یہ شہر سب سے آگے ہے اور مخطوطات و نوادرات کو اپنے دامن میں چھپائے رکھنے کی شہرت پوری دنیا میں اسے حاصل ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ اس شہر کی رونق شاہی نوازشات اور حکومت کے زیر سایہ علمی و ادبی خدمات سے تھی۔ ۱۹۴۸ء کے بعد گو رونق و شادمانی کا یہ سامان باقی نہ رہا، لیکن غیرتِ ایمانی اور اسلام کے لیے دردمندی نیز ادب پروری اور علم دوستی کا جو سبق یہاں کے اسلاف نے اپنے اخلاف کو دیا تھا، اس کی چنگاریاں اب بھی موجود تھیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ یہاں از سرِ نو ادبی انجمنیں اور ادارے قائم ہوئے، تنظیمیں اور جمعیتیں قائم ہوئیں اور جو پہلے سے قائم تھیں، ان میں سرگرمی اور حرارت پیدا ہوئی اور دینی مدارس و مکاتب قائم کیے گئے، جن کی ضرورت بہ مقابلہ دوسرے علاقوں کے یہاں زیادہ تھی، اسی طرح اب یہاں باوقار عصری درسگاہوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، متعدد انجینئرنگ کالجس ہیں، میڈیکل کالج بھی ہے، متعدد ہاسپٹل بھی ہیں اور یہ سب اقلیتی ادارے مسلم انتظامیہ کے تحت خوبی اور کامیابی کے ساتھ بحمد اللہ چل رہے ہیں۔

"دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد" جس کے زیر اہتمام "خطباتِ حیدر آباد" منعقد کیے جا رہے ہیں اور جس کی دعوت پر آپ حضرات یہاں تشریف لائے ہیں، اسی تعلیمی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس کا ۱۳۹۳ھ میں قیام عمل میں آیا اور قیام کے سولہویں سال ۱۴۰۸ھ میں دورۂ حدیث شریف کا افتتاح ہوا۔ فقہ کے میدان میں مردانِ کار کی تیاری شروع سے جامعۂ ہٰذا کے ذمہ داران اور اساتذہ کا مطمحِ نظر ہے، اسی مقصد کے لیے ۱۴۰۹ھ میں "تخصص فی الفقہ" کے دو سالہ نصاب کا افتتاح عمل میں آیا، فرقِ باطلہ اور قدیم و جدید مذاہب و نظام کے مطالعہ اور مخالف اسلام تحریکات سے آگہی، نیز اسلام کے اصولِ دعوت سے واقفیت کے لیے ۱۴۱۰ھ میں "تخصص فی الدعوہ" کا شعبہ قائم ہوا، ۱۴۱۱ھ میں ائمۂ مساجد کی تربیت و تدریب کے لیے "تدریب الائمہ" کا ایک سالہ نصاب شروع کیا گیا ہے، عربی اور اردو میں علی الترتیب پانچ سال اور تین سال کا مختصر مدنی عالم کورس بھی عصری تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے موجود ہے۔

فکری اعتدال، وسیع المشربی، فراخ چشمی، تنگ نظری سے گریز اور ہر مکتبۂ فکر سے خیر کا

حصول بحمد اللہ اس ادارہ کے مزاج و مذاق میں داخل ہے اور اسی لیے یہ دار العلوم مختلف مکاتبِ فکر اور مختلف درسگاہوں کے اساتذہ و طلباء کا ایک گلدستہ سا ہے اور بحمد اللہ یہاں متعدد ایسے اساتذہ موجود ہیں جو اپنی علمی خدمات و تالیفات اور متوازن فکر، نیز مطالعہ و تحقیق پر مبنی آراء کی وجہ سے ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی پہچانے اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور اس نو عمر درس گاہ کے فضلاء اور متخصصین نے مختلف علمی اور تحقیقی موضوعات پر بہتر کام کیا ہے، جسے اہل علم اور اصحابِ ذوق نے سراہا ہے۔ یہاں باضابطہ دار الاشاعت قائم ہے، اس کے علاوہ دار القلم، مرکز البحث والدعوۃ (مرکزِ دعوت و تحقیق) اور طوبیٰ پبلی کیشنز کا اخلاقی رابطہ بھی اس ادارہ سے ہے، یہاں سے سہ ماہی جریدہ "صفا" بھی نکل رہا ہے، اس ادارہ میں کمپیوٹر کی تربیت کا بھی نظم ہے، بعض صنعتی شعبے بھی قائم ہیں، نصابِ تعلیم کی ترتیب میں "قدیم صالح اور جدید نافع" کا لحاظ رکھا گیا ہے، باوقار کتب خانہ کے ساتھ طلبہ اور اساتذہ کے لیے دار الاخبار اور دار المطالعہ بھی ہے، دیہاتوں میں دینی تعلیم کی اشاعت کے لیے متعدد مکاتب چلائے جا رہے ہیں، عمومی دعوت و تبلیغ اور صیانتِ عقیدۂ ختم نبوت کے لیے مبلغین بھی ہیں، طلبہ اور اساتذہ دعوتی کام سے وابستہ بھی ہیں اور تعطیلات میں عملاً اس کام میں حصہ لیتے ہیں؛ تاہم ؎

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے ‌ ‌ ‌ ‌ جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

اخیر میں صاحبِ خطبات، مہمانانِ خصوصی، شہر کے معزز و محترم احباب و رفقاء اور روزنامہ سیاست، منصف، رہنمائے دکن اور عوام کا شکر گذار ہوں، کہ ان خطبات کے انعقاد اور ان کی تشہیر و تعارف میں ان سب کا بڑا تعاون رہا ہے، اسی طرح دار العلوم سبیل السلام کے اساتذہ، طلبہ اور کارکنان کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں، کہ ان کی شبانہ روز محنتوں اور کاوشوں ہی سے ہم یہ اہم پروگرام منعقد کرنے کے لائق ہوئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان خطبات کو نہ صرف اس شہر کے لیے بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ کے لیے نافع اور ان کی زندگی میں صالح انقلاب کا ذریعہ و وسیلہ بنائے اور ہم سب کی اس ملی جلی جد و جہد کو قبول فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

۱۶/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ ‌ ‌ ‌ ‌ محمد رضوان القاسمی

۲/جولائی ۱۹۹۹ء (جمعہ)

اُسوۂ حسنہ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

...نتِ الٰہی

بزمِ کائنات اپنی ساری دلفریب زینتوں اور دلکش آرائشوں کے ساتھ سج چلی، طلسم خانۂ ...رت اپنی تمام ندرتوں اور نیرنگیوں کے ساتھ تیار ہو چکا، نگار خانۂ موجودات کا ایک ایک نقش آب ...نگ کی جگمگاہٹ سے چمک اٹھا، اس وقت مَا کَانَ وَ مَا یَکُوْنُ کا سب سے زیادہ بے بہا، سب سے ...دہ عزیز الوجود گوہر "امانتِ الٰہی" کے نام سے کثرت کے بازار میں پیش ہوا اور وحدت کے خلوت ...ہ سے آواز آئی کہ: "ہے کوئی جو اس گوہر شرف کا حامل بن سکے؟ ہے کوئی جو اس بارِ امانت کو اٹھا ...لے؟ عالم ملکوت میں سناٹا چھا گیا، عالم ناسوت پر لرزہ پڑ گیا، پہاڑ تھر تھرائے، سمندر کی موجیں رُک ...یں، ماہتاب ماند پڑ گیا، آفتاب کی ہمت نے جواب دے دیا، اُونچے آسمانوں نے اپنے دوشِ ناتواں کو ...س کا اہل نہ پا کر آنکھیں نیچی کر لیں، پھیلی ہوئی زمین اپنے عجز و درماندگی کے احساس سے سمٹ کر رہ ...ی، اس وقت ضعیف و ناتواں، کمزور و حقیر، ظلوم و جہول، خاک کا پتلا آگے بڑھا اور اپنی ہمت کے ...وؤں کو پھیلا کر یہ بارِ عظیم اپنے سر لے لیا۔

...بح محشر

خاک نژاد آدم کی بے شمار نسلیں پیدا ہوئیں اور رخصت ہو گئیں، پھیلی اور بڑھیں، اُبھریں اور ...یں، یہاں تک کہ عالم عنصریات کی شبِ دراز ختم ہوتی ہے اور صبح محشر کا طلوع ہو جاتا ہے، کمزور و ...ند باز، خطاکار و نسیاں شعار انسان طلب ہوتا اور اُس کا ہر فرد "امانت" کا حساب سمجھانے حاضر ہوتا ہے، ...راد کی تعداد حدِ شمار سے خارج ہے، ریاضی کا ہر عدد، سب کی گنتی بتانے سے قاصر ہے، اچھے اور برے، ...ق و فاجر، مؤمن و کافر، عالم و جاہل، شاہ و گدا، امیر و فقیر، حکیم و شاعر، عابد و زاہد، ولی و درویش، سب ...یک ایک کر کے صف در صف حاضر ہو رہے ہیں، لیکن کسی ایک کا بھی نامۂ عمل فطرت کے محاسبہ پر

پورا نہیں اُترتا، کسی ایک کا بھی دامنِ امانت، خیانت کے داغ سے پاک نظر نہیں آتا، کسی ایک کی بھی فردِ اعمال ایسی نہیں جو دعوے کے ساتھ پیش ہو سکے، ہر سمت حسرتیں، ندامتیں، پشیمانیاں اور پریشانیاں ہیں، زاریاں اور بیقراریاں، افسردگیاں اور غمگینیاں ہیں، انتہا یہ ہے کہ وہ نفوسِ قدسیہ تک، جو دوسروں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے خلق ہوئے تھے اور جو عرش کا پیام لے کر فرش پر آئے تھے، آج اپنی اپنی حالت میں گرفتار ہیں اور زبانوں پر نفسی نفسی کا وظیفہ جاری ہے۔

گستاخ و شوق چشم انسان، اس وقت بھی تمرو خیرہ سری سے باز نہیں رہتا اور سوال کر بیٹھتا ہے، کہ ایسی ناقص ہستیوں کے وجود میں لانے کا کیا ثمرہ تھا، جن میں سے کوئی ایک بھی معیارِ کمال پر پوری نہیں اُترتی؟ اس بے شمار انبوہ کو خلعتِ وجود سے مشرف کرنے کا کچھ بھی حاصل تھا، جس کا ایک فرد بھی اپنے مقصدِ آفرینش کو پورا نہ کر سکا؟ حریم قدس سے آواز آتی ہے کہ دیکھ اے جاہل انسان اور اپنی جہالت کا اقرار کر، سن اے نادان آدم زاد اور اپنی نادانی پر شرما، یہ پیکرِ نورانی جو تیرے سامنے عرصۂ محشر میں موجود، اپنی ذات کی طرف سے فارغ و مطمئن اور دوسروں کے نجات دلانے کی کوشش میں مصروف و سرگرم نظر آرہا ہے، تیری ہی طرح ایک انسان تھا، تیری ہی طرح اس کا خمیر آب و گل سے تھا، تیری ہی طرح خاک کے ذرّوں سے اپنے جسدِ عنصری کی ترکیب رکھتا تھا، لیکن ہمارا عبدِ کامل تھا، ہماری امانت کا پورا امین اور اپنے عہد کو بنانے والا، قیدِ عناصر میں داخل ہونے سے قبل ہر وقت ہماری حمد و ثنا میں مشغول رہا، تو ہم نے احمد (بہت تعریف کرنے والا) کے نام سے پکارا اور اس کا صلہ یہ دیا کہ جب عالم آب و گل میں پابند بنا کر بھیجا، تو اس کا لقب محمد (بہت تعریف کیے گئے) رکھا۔ دیکھ اے غافل انسان کہ آج نہ صرف ہم اپنے اس سب سے اچھے اور سب سے پیارے بندہ کو کیا درجہ نصیب کرتے ہیں، بلکہ جس، کسی نے اس کی پیروی کی بھی کوشش کی، اس کے لیے بھی آج ہمارے ہاں کیا کیا سر فرازیاں اور سر بلندیاں موجود ہیں۔

دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ جایئے، حکیموں اور داناؤں کے سوانح حیات پڑھ جایئے، درویشوں اور عالموں کے کارناموں پر نظر کر جایئے، حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی دعوتوں سے واقفیت حاصل کر لیجئے، دنیا کی بڑی سے بڑی اصلاح، بڑے سے بڑے انقلاب، بڑے سے بڑے اجتہاد کا مطالعہ کر جایئے، ہر اصلاح، ہر دعوت، ہر تبلیغ، کسی نہ کسی ملک، کسی نہ کسی قوم، کسی نہ کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص و محدود آپ کو ملے گی، حضرت مسیح علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے گلوں کی بھیڑوں کو بچانے کے لیے آئے تھے، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت صالح علیہ

السلام سب کا روئے سخن صرف اپنی اپنی قوم کی جانب تھا، دنیا کے اس عالمگیر کلیہ سے اگر کوئی استثناء ہو سکتا ہے، تو وہ محمدؐ عربی (روحی فداہ) کی دعوت و پیام کا تھا، رسول اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کسی ایک ملک، کسی ایک قوم، کسی ایک زمانہ کے لیے نہیں، ہر ملک، ہر قوم، ہر زمانہ کے لیے ہے، تمدنِ انسانی کی ہر سطح کے متناسب، حالتِ بشری کے ہر درجہ کے لیے موزوں اور معاشرتِ قومی کی ہر شان کے شایاں۔

کمال اور ختمِ نبوت

سید المرسلین کا ایک لقب خاتم النبیین بھی ہے۔ ختم نبوت کے معنی بالکل واضح ہیں۔ جب ایک پیام اس قدر جامع و مکمل آچکا کہ اب اس میں کسی ترمیم و اضافہ کی گنجائش ہی نہیں باقی، تو کسی جدید پیام کا آنا سرے سے بے معنی ہو جاتا ہے، پیام کی ہمہ گیری کے معنی ہی یہ ہیں، کہ آیندہ کے لیے سلسلۂ پیامات منقطع۔ عرب کے اُمی کے لائے ہوئے پیام نے علی الاعلان اپنا دعویٰ ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا، کہ میں ہر امکانی ضرورتِ زندگی کے لیے مکمل ہدایت نامہ ہوں اور آج تک بڑے سے بڑا مخالف بھی اس دعویٰ کو کسی دلیل سے جنبش نہ دے سکا۔

پیام اور پیامبر

اس قدر جامع و مکمل پیام کے لیے ضروری تھا کہ اس کے لانے والے کی ذات بھی ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہو۔ اللہ کا بھیجا ہوا پیام، لکھا لکھایا، مرتب کتاب کی شکل میں بھی کسی پہاڑ یا درخت پر آسمان سے اتر سکتا تھا، لیکن حکیم مطلق کی مشیت نے پیام اور ''پیامبر'' دونوں کو ایک دوسرے کے لیے بطورِ لازم و ملزوم قرار دیا اور دونوں کو ایک دوسرے کی تصدیق کا ضامن؛ لیکن ترتیباً پیامبر کا وجود پیام پر مقدم ہے۔ دنیا کا یہ آخری ہادی و رہنما پورے چالیس برس اپنے ہم جنسوں کے درمیان رہ لیا، جب جا کر اس پر پیامِ حق نازل ہونا شروع ہوا اور اس کے بعد تیئس سال کی مدت اور اس نے اپنے ہی جیسے انسانوں کے درمیان گذار دی۔ اس کی پاک و پاکیزہ زندگی اس وقت بھی دشمنوں کے لیے ایک کھلے ہوئے چیلنج کی طرح موجود رہی، کہ کوئی اٹھے اور اس میں عیب نکالے، کوئی بڑھے اور اس پر حرف گیری کرے، ابوجہل اور ابولہب جیسے دشمن اٹھے اور بڑھے، لیکن اس مقدس سیرت، اس پاکیزہ زندگی اور اس پاک معاشرت میں ایک بات بھی قابل گرفت نہ پا سکے۔

محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ بنا کر نہیں بھیجے گئے، کسی دوسرے عالم کی مخلوق کی حیثیت سے نہیں اتارے گئے، حوائجِ بشری سے بے نیاز ہو کر نہیں مبعوث ہوئے، انسان بنا کر،

بشریت کے تمام اوصاف ولوازم، تمام احتیاجوں اور ضرورتوں کے پابند بنا کر اس ظلمت کدۂ گیتی کو مطلعِ انوار کرنے کے لیے بھیجے گئے، شادیاں آپؐ نے کیں، ایک نہیں کئی کئی، اولادیں آپؐ کی متعدد ہوئیں، بعض زندہ رہیں اور بعض نے حضورؐ کے سامنے وفات پائی، دوست بھی حضورؐ کے بہت سے تھے اور دشمن بھی تھے، مخلصین کا بھی ایک گروہ تھا اور منافقین کا بھی، عسرت کا بھی زمانہ گزرا اور خوش حالی کا بھی، لڑائیاں بھی بہت سی ہوئیں اور امن کا زمانہ بھی گزرا، محاربات میں کبھی فتح بھی ہوئی اور کبھی اس کے برعکس، خلقت کے ردّ وانکار کا بھی تجربہ فرمایا اور مقبولیت ومرجعیت کا بھی، غرض انسانی زندگی میں گرم وسرد، نشیب وفراز کے جتنے مواقع پیش آسکتے ہیں، سب سے ہو کر وہ پاک وطاہر زندگی گزری اور اس طرح بے داغ گزری، کہ آج محض اس کا مطالعہ سارے عالم کے لیے ایک مستقل درس بن سکتا ہے۔

جامعیت

حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کی یہ جامعیت صرف اس لیے تھی، کہ ہر فردِ بشر اس نمونہ کو اپنے پیش نظر رکھے اور جہاں تک اس کا ظرف وبساط اجازت دے انہیں قدموں کے نقش پر چلے۔ گلستانِ دَہر میں بار بار وح پرور بہاریں آچکی ہیں، لیکن موسم ربیع کا یہ گلدستہ ایسا ہے جو ہر ملک، ہر زمانہ، ہر قوم کے مشامِ جاں کو معطر رکھے گا۔ آج دنیا کی سب سے بڑی شامت یہی ہے، کہ اس نے سب سے زیادہ کامل ومکمل نمونہ کی طرف سے قطع نظر کرلی، غیروں کا ذکر نہیں، خود ہم کلمہ گویانِ اسلام کی بدبختی یہی ہے کہ ہم نے آفتابِ ہدایت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے تئیں یا تو اندھیرے میں ڈال رکھا ہے اور یا اگر روشنی کی طلب ہے بھی تو ٹمٹماتے ہوئے چراغوں اور لالٹینوں پر قناعت ہے۔

ہم میں سے آج کتنے بدبخت مسلمان ایسے ہیں، جو خوبی وکمال کا معیار یورپ کے طور وطریق کو سمجھ رہے ہیں، قومی تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ یورپ میں اس کا رواج ہے، معاشرت کو اعلیٰ معیار پر اس لیے لانا چاہیے کہ یورپ کا طرز یہی ہے، سود خواری اس لیے بہتر ہے کہ یورپ اسی ذریعہ سے ترقی کر رہا ہے۔ یہ ہمارے دماغوں کا ایک عام طرزِ استدلال ہو گیا ہے۔ اس سے اُتر کر وہ طبقہ ہے جو مذہبی سمجھا جاتا ہے۔ ان بے چاروں کی شامت یہ ہے کہ بجائے سرکارِ رسالتؐ سے اکتسابِ فیض کرنے کے، انہوں نے ساری جستجو اور تگ ودو محض کسی عالم یا درویش تک محدود کر رکھی ہے؛ حالانکہ کوئی امتی کتنا ہی بلند پایہ ہو، ظاہر ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین مبارک کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔

اگر آج ہم اس بڑے "امین" کے نقش قدم پر چلتے ہوتے تو ہم میں خیانت و بددیانتی کا گزر نہ ہوتا، اگر آج ہم اس "رؤف ورحیم" کے پیرو ہوتے، تو ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی جانب سے بے اعتمادی و بدگمانی نہ ہوتی، اگر آج ہم نے اس غارِ حرا کے بیٹھنے والے کے آثارِ مبارک کو اپنا سرمۂ چشم بنایا ہوتا تو ہمارے باطن میں کسی قسم کی گندگی باقی نہ رہ جاتی، اگر آج ہم فاتحِ بدر کی عظمت دل سے کرنے والے ہوتے، تو مخالفین کے مقابلہ میں ہمیں شکستیں نصیب نہ ہوتیں، اگر آج ہم رحمتہ للعالمین کے پیام پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوتے، تو اپنی جیسی مخلوقات کے ساتھ ہمیں بے گانگی و مخالفت نہ ہوتی، اگر آج اپنے سچ بولنے والے اور سچ کے برتنے والے نبیؐ کے طریقہ پر ہم قائم ہوتے، تو جھوٹ کا ہماری آبادیوں میں نام و نشان ہی نہ ہوتا، اگر آج ہم کو اسمِ پاک احمدؐ کی لاج ہوتی تو اللہ کی حمد و ثنا سے ہمیں اس قدر گریز نہ ہوتا، اگر آج ہم کو اسمِ گرامی محمدؐ سے عملاً کوئی واسطہ ہوتا، تو اپنی موجودہ پستی و بدنامی سے یہ مراحل دور ہوتے۔ آج جب کہ سارے ملک میں میلادِ مبارک کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہوں گی، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان کے ساتھ ساتھ ہم اپنے خلوت خانۂ قلب میں بھی کچھ دیر کے لیے ذکرِ پیمبر و یادِ رسولؐ کی محفل گرم کریں۔

☆☆☆

سیرتِ نبوی ﷺ کا پیغام امتِ محمدیہ کے نام!

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

برادرانِ اسلام اور میری بہنو! آج یہ آخری خطبہ ہے۔ اس سلسلہ کا آخری خطبہ، لیکن سیرت ایک ایسا وسیع وعریض اور اتھاہ سمندر ہے، جس کا کوئی حصہ آخری نہیں، کوئی بڑے سے بڑا صاحبِ علم بھی زندگی کے اپنے طویل سے طویل اوقات صرف کردے، پھر بھی وہ سیرت کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف انسانی زندگی کے ہر حصہ پر محیط ہے، انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اور ہیومن لائف کی کوئی برانچ ہو، اس کی جتنی بھی کیفیات ہوسکتی ہیں، ان میں سے کوئی کیفیت ہو، باہمی تعلقات کی جتنی قسمیں ہوسکتی ہیں، وہ ساری قسمیں ایک فرد کی حیثیت سے، ایک اجتماع کی حیثیت سے اور ایک جماعت، ایک سوسائٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے، انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، معاشرتی زندگی کے جتنے حصے ہیں، چاہے میاں بیوی کے تعلقات ہوں، اولاد اور والدین کا رشتہ، بھائی بھائی اور بھائی بہن کا رشتہ ہو، پڑوسی کا رشتہ اور انسانوں کی معاشیات کے مسائل، کیا کمائیں؟ اور کیسے خرچ کریں؟ پوری انسانی زندگی اور پوری دنیا کی معاشی حالت اور ان کی اکونومی کی درستگی کا راستہ کیا ہوسکتا ہے؟ اخلاق کی بنیادیں کیا ہیں؟ اخلاق میں بنیادی چیز کیا مطلوب ہے؟ کس لیے اخلاق برتا جائے؟ اخلاق کی جڑیں کہاں ہیں؟ اور اس طرح کے لاکھوں موضوعات ہیں، جن پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی حاوی ہے۔

وہ حکمراں بھی رہے ہیں، فوج کے جرنیل بھی رہے ہیں اور وہ صلح کی میز پر بھی بیٹھے ہیں، وہ ایک اچھے شوہر کی حیثیت سے بھی نمونہ ہیں، اچھے بھائی اور اچھے چچا کی حیثیت سے بھی، اچھے دوست اور اچھے ساتھی کی حیثیت سے بھی، انفرادی، اجتماعی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور جتنی قسم کے انسانی حالات ہوسکتے ہیں اور ان سب پر مستزاد آخرت کی فلاح کے لیے اور مرنے کے بعد جو زندگی آنے والی ہے، اس کی بھلائی اور اس کی کامیابی کے لیے جو نمونہ ہوسکتا ہے، وہ سارے نمونے حضور ﷺ کی حیاتِ

مبارکہ میں موجود ہیں، اس لیے کوئی بھی بیٹھ جائے، پانچ نہیں پچاس خطبات سامنے ہوں، پھر بھی اس موضوع کا حق ادا نہیں ہو سکتا، کبھی تو اپنی کم علمی سامنے آتی ہے اور کبھی وقت کی کمی دامن گیر ہوتی ہے۔
خطبات کے اس سلسلے میں آپ کو چاہے کم فائدہ پہنچا ہو، لیکن ذاتی طور پر مجھے بہت فائدہ پہنچا ہے۔

ذکرِ حبیب کم نہیں وصل حبیب سے!

ہو سکتا ہے دوستوں کو یہ احساس ہو کہ سیرت کے وہ واقعات بیان کرتے ہیں جن کو ہم لوگ جانتے ہیں، عام مواعظ اور تقریروں میں وہ باتیں آتی رہتی ہیں، اگر آپ ایسا کہیں تو آپ کا کہنا بالکل درست ہوگا اور میں نے جان بوجھ کر ایسی باتیں دہرائی بھی ہیں۔ دو باتیں ذہن میں ہیں: ایک تو یہ کہ مجموعی طور پر آپ سب مل کر شاید سب باتیں جانتے ہوں، لیکن انفرادی طور پر ضروری نہیں کہ ہر آدمی ہر بات جانتا ہو، دوسری ایک اس سے زیادہ اہم بات وہ ہے دوستو جو کسی شاعر نے امام اعظم ابو حنیفہؒ کے بارے میں کہی ہے اور حقیقت ہے کہ یہ بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں صادق آتی ہے۔ "أعد ذکر نعمان لنا أنّ ذکره هو المسك ما کررته یتضوّع"، نعمان کا ذکر بار بار کرتے رہو، اس لیے کہ وہ سراسر مشک کا ڈھیلا ہے کہ جتنا اس کو گھسا جائے گا اتنی ہی اس کی خوشبو پھیلتی چلی جائے گی، پس آقا کا تذکرہ جتنا بھی ہم کریں، وہ تو مشک ہی مشک ہے، اس میں کوئی ملاوٹ تھوڑا ہی ہے، اس کو تو جتنا گھسوا تنا ہی اس کی خوشبو پھیلتی ہے، بس آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا جتنا ذکر کیجیے اتنا ہی اس سے فائدہ پہنچتا ہے، اس سے خوشبو ملتی ہے، اس لیے بھی کہ دوستو! "ذکرِ حبیب کم نہیں وصل حبیب سے"؛ پس جو وقت بھی ہم نے گذرا دراصل وصل حبیب میں گذارا ہے۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں، آپ نے اور ہم نے مل کر یہ مجلسیں سنواری ہیں، جہاں تذکرۂ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم نے کچھ عرصے کے لیے اپنے کو وہاں پہنچا دیا ہے جہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں؛ کبھی ان کا بچپن ہے، کبھی ان کی جوانی ہے، کبھی وہ سفر کے حال میں ہیں، کبھی وہ دعوت کے رستے میں پتھر کھاتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں، کبھی مدینہ میں بیٹھ کر معاملات و مسائل کو حل کر رہے ہیں اور کبھی اللہ کے حضور سر بسجود ہیں، کبھی وہ معراج کی منزلوں سے گذر رہے ہیں، غرض یہ کہ حضور کی زندگی کا ہر حصہ ایسا ہے کہ جس پہلو پر غور کرو، سامانِ عبرت پاؤ اور اسوۂ حسنہ سے سرفراز ہو، ہر جا ذہن کو ایک نئی تازگی حاصل ہو اور دولتِ طمانیت میسر آئے۔ شاعر کی زبان میں ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ ایں جا است

جس طرح آپ شوق وذوق کے ساتھ آتے رہے ہیں، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ بھی ایک خاص لذت اور ذوق کے ساتھ اپنے آقا کے اس تذکرے میں شریک ہیں۔ صلی اللہ علی سیدنا محمد۔ بات تو جو مجھے کہنی ہے آگے کہوں گا، لیکن اس بیچ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں، جو بہت زیادہ ذہن پر مسلط ہے۔ چار دن آپ نے خطبہ سن لیا، آج پانچویں دن آپ سن رہے ہیں، بے شک جتنا بھی سیرت کا عنوان ہے، اس کے اعتبار سے سمندر کے ایک قطرے کے برابر یہ حصہ ہے، جو ابھی تک آپ کے سامنے آیا ہے؛ لیکن بہر حال ان پانچ دنوں میں تقریباً آٹھ گھنٹے کی سیرت جتنی کچھ آپ نے سنی، میں نے اس میں صرف ایک بات کی کوشش کی ہے اور یہ محض اللہ کی طرف سے ہے، اس میں میری کوشش کا کوئی دخل نہیں۔

امت کے جوڑنے والی سیرت

سیرت کے اس تذکرے میں کوئی ایسی بات نہیں آئی جس میں امت کا اختلاف ہو، یہ بھی بنیادی نکتہ ہے جو آپ کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ سیرت کے اس طویل تذکرہ میں کوئی ایسی بات نہیں آئی جس میں امت کا اختلاف ہو اور جھگڑا ہو، مجھے صرف آپ کو اس طرف متوجہ کرنا ہے، خصوصاً اپنے علماء کو، اربابِ عقل و دانش کو، اربابِ حل وعقد کو اور ذمہ داروں کو کہ دوستو! سیرتِ مبارک اسلام کی ایک نمائندہ زندگی ہے، جن مسائل پر امت کا اتفاق ہے وہ بہت زیادہ ہیں اور جن مسائل میں امت کے درمیان اختلاف ہے وہ بہت کم ہیں، پھر ہم کیوں ان مسائل کو چھیڑ کر امت کو ٹکڑیوں میں بانٹتے ہیں؟ جو مسائل تفریق واختلاف کا باعث بنتے ہیں، ہم کیوں نہیں ان مسائل کو مضبوطی سے تھامتے ہیں جن سے امت ایک رہے، خاص کر موجودہ حالات میں اور خاص کر ہندوستان میں؟

ان خطبات میں میں نے دو باتوں کی خاص رعایت کی ہے، ایک یہ کہ میں مستند روایات سے گرنے نہ پاؤں اور آپ کو سیرت اس طرح سناؤں جو صحیح روایتوں سے ثابت ہو، یا خود قرآن سے ثابت ہو، دوسری بات جو میری کوشش نہیں، خود بخود ابھر کر آتی ہے، یہ ہے کہ کتنی ہی تفصیل کے ساتھ ہم سیرت کو بیان کرتے چلے جائیں، حضورؐ کی سیرت انسانوں کے دلوں کو جوڑے گی، دلوں کو توڑ نہیں سکتی۔ پس لوگو! دل یہ چاہتا ہے کہ جو مجلس بھی حضورؐ کے نام پر منعقد ہو، جو وعظ بھی حضورؐ کی دعوت کے نام پر ہو اور جو اجتماع بھی حضورؐ کی تعلیمات کے نام پر ہو، وہ انسانوں اور مؤمنوں کے دلوں کو جوڑنے والا ہو، ان کے درمیان انتشار پیدا کرنے والا نہ ہو۔ اس کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ آپ اصول کو لیں، جزئیات کے اختلاف کو اختلافِ رائے پر محمول کریں؛ جس میں ہمارے آقا صلی

اللہ علیہ وسلم کا صاف ارشاد ہے کہ جس نے اجتہاد کیا، حقیقت کی یافت کے لیے کوشش کی (میں اجتہاد کی اصطلاحی تعریف میں نہیں جاتا، اس کے لیے دلیل میرے پاس یہ ہے کہ اجتہاد کی اصطلاحی تعریف جو فقہاء نے کی ہے، یہ لفظ عہدِ نبویؑ میں اس معنی میں معروف تھا یا نہیں؟ بہت قابل غور ہے، اس لیے کہ نبیؑ نے اجتہاد کی کوئی تعریف متعین نہیں کی اور نبیؑ کے کلام کو نبیؑ کے ماحول میں اور نبی کی لغت میں سمجھنا ہوگا) پس جو شخص بھی حقیقت اور سچائی کو پانے کی آخری کوشش کرے اور اپنی کوشش میں کوئی کمی نہ چھوڑے، اس کے بعد اگر وہ صحیح نتیجہ پر پہنچا تو اس کے لیے دو ثواب، اگر غلطی بھی ہوئی تو ایک ثواب سے محروم نہیں رہے گا۔ یہ ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ تو ایسی صورت میں وہ مسائل جو امت کے درمیان مختلف فیہ ہیں، ایسے مختلف فیہ اور مجتہد فیہ مسائل کو منصوص کا درجہ دے کر اس پر کفر اور ضلال و گمراہی کا فتویٰ دے کر امت کو جنگ و جدال میں مبتلا کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وفاداری نہیں ہو سکتی۔

اے میرے عزیز دوستو! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِی کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ'' (بخاری: ۱/ ۲۳) ''تم لوگ ہمارے بعد کفر اور گمراہی میں مبتلا مت ہو جانا کہ تم میں سے ایک دوسرے کی گردن مارنے لگے''۔ بات بات پر ایک دوسرے کو کافر، فاسق اور ضلال و مضل قرار دینا بھی دراصل معنوی اعتبار سے گردن مارنے اور قتل کر دینے ہی کے درجہ میں ہے اور اسی لیے اس حدیث میں ان تمام باتوں کی ممانعت ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی آپ سے عرض کیا تھا: آپ کی انتہائی درجہ شفقت اس امت پر ہے، آپؐ بہت مہربان ہیں، حضورؐ ایک دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! میری امت کو قحط کے عذاب میں برباد مت کیجئے گا، ایسا نہ ہو کہ ایسا قحط پڑے، ایسا اکال پڑے کہ لوگ بھوکے مر جائیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے حبیب! میں نے آپ کی دعا قبول کی اور آپ کی امت کبھی بھی قحط اور اکال کے عذاب میں برباد نہیں ہوگی، یہ تو وعدہ لے لیا گیا، اس لیے آپ کے پیٹ کے مسئلہ کا اطمینان ہے، بھوک سے مریے گا نہیں ان شاء اللہ، دوسری دعا فرمائی کہ میری امت کی گردن پر غیروں کی تلوار مسلط نہ کیجئے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے رسول! آپ کی یہ دعا بھی قبول، مگر ایک شرط کیساتھ، جب تک آپ کی امت خود اپنی تلوار اپنے بھائی کی گردن پر نہیں اٹھائے گی، تب تک آپ کی امت پر غیروں کی تلوار مسلط نہیں ہوگی۔ لگتا ہے کہ جیسے آج ہمارے آقا کھڑے ہو کر یہ خبر ہمیں سنا رہے ہوں، ہم نے زندگی میں بہت تجربے کر لیے ہیں، آج تک کوئی خوشخبری نہیں ملی ہے، جب ملی ہے تو یہی کہ ہم نے خود اپنی قوت اپنے خلاف استعمال کی ہے اور اس کے نتیجہ کو

ہم بھگت رہے ہیں۔ پس میں بہت درد مندی کے ساتھ سیرت کے اس اہم ترین سلسلہ میں یہ توجہ دلانا چاہتا ہوں آپ کو کہ پڑھیے ہمارے آقا کی سیرت، آقاؐ نے جوڑا ہے دلوں کو توڑا نہیں ہے ؎

سلام اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

پس اے حضورؐ کے نام لیواؤ! تم بھی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا کام کرو اور باطل کی زنجیریں تو توڑو، لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ امت خود ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائے۔ اتنی سی بات ذہن پر سوار تھی، پتہ نہیں تھک جاتا تو اس بات کو کہہ نہیں پاتا، اس لیے اتنی سی بات میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دی ہے۔

عدل۔ شریعتِ اسلامی کی روح!

اب میں آگے بڑھتا ہوں جو دراصل کل کی گفتگو کا تسلسل ہے۔ ایک بہت اہم بات جس کی طرف میں آپ کو لانا چاہتا ہوں، وہ اسلام کا مالی اور معاشی نظام ہے اور یہ بات آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جمعہ کے خطبہ میں جو آیت آپ سنتے ہیں، تقریباً ہر خطیب خطبۂ جمعہ میں اس کو سناتا ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰى وَ یَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔'' (النحل: ۹۰) ''اللہ تم کو حکم کرتا ہے عدل کا، اللہ تم کو حکم کرتا ہے احسان کا، اللہ تم کو حکم کرتا ہے رشتہ داروں کو دینے کا، اللہ تم کو منع کرتا ہے بے حیائی سے، برائی سے اور ظلم سے''۔ یہ امہاتِ آیات میں سے ہے، ان آیتوں میں اس کا شمار ہے جس کی حیثیت پوری شریعت میں اصل اور جڑ کی ہے، جس سے بے شمار قوانین نکلتے ہیں، بلکہ اس کی حیثیت اس کسوٹی کی ہے جس پر ہر انسانی عمل کو جانچا اور ہر قانون کی صداقت اور صحت اور اس کی غلطی کو جانچا جا سکتا ہے۔ تفصیل کا تو ظاہر ہے کہ یہ موقعہ نہیں ہے، لیکن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عدل کا مفہوم کیا ہے؟

عدل سے مراد

یہ قرآن مجید کی بڑی اہم اصطلاح ہے اور اس میں بہت سے شکوک و شبہات کا جواب موجود ہے۔ آج کل یورپ نے ایک نعرہ دیا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے، میں نے بھی عرض کیا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان اللہ کی شریعت میں بحیثیتِ انسان کوئی فرق نہیں ہے، حقوقِ انسانی میں عورت اور مرد دونوں برابر ہیں، بحیثیتِ انسان مرد کو جو عزت اور وقار حاصل ہے، وہی عزت اور وقار عورت کو حاصل ہے، دونوں کی تکریم میں کوئی فرق نہیں، بحیثیتِ انسان اگر مرد کو پراپرٹی رائٹ حاصل ہے اور وہ اشیاء کا مالک بن سکتا ہے، تو اسی طرح عورت کو بھی

آزادانہ بالاستقلال، بلاکسی دوسرے کی محتاجی کے مالک ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے، جیسے ایک مرد کی ملکیت پر دوسرے شخص کو اس کی منظوری کے بغیر تصرف کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، اسی طرح کسی عورت کی پراپرٹی پر بھی اسکے شوہر یا باپ یا بیٹے یا اس سماج کو کسی طرح تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، جتنے احکام بحیثیت انسان شریعت نے دیئے ہیں، اس میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مرد ایک الگ صنف ہے اور عورت ایک الگ صنف ہے، دونوں کی صنفی خصوصیات ہیں، دونوں کو پیدا کرنے والے نے دو مقصد کے لیے پیدا کیا ہے، دونوں کا دو Purpose ہے۔ اب اگر وہ مساوات کا اصول وہاں پر برتا جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ فطرت کو ہم الٹ دینا چاہتے ہیں، اسی لیے سماج کی بعض ذمہ داریوں میں مرد اور عورت کے درمیان فرق کرنا عین منشاءِ فطرت ہے، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس صنفی فرق کی وجہ سے جو احکام دیئے جائیں، ان احکام میں چاہے مرد کو یا خاتون کو کسی طرح کی ذلت کا سامنا کرنا پڑے، تذلیل کسی کی نہیں ہوسکتی۔ یہ فرق ہے مساوات کا اور عدل کا! مساوات برابری کا نام ہے اور عدل ہر شخص کی صلاحیت کے لحاظ سے اس کے حقوق و فرائض متعین کرنے کا ؛ اسی لیے اسلام عورت اور مرد کے درمیان بحیثیتِ میاں بیوی عدل کا حکم دیتا ہے۔ ابھی مجھ سے امریکہ میں سوال کیا گیا : کہتے ہیں کہ عورت کو اسی طرح نماز پڑھنا چاہیے جس طرح مرد پڑھتا ہے، یعنی مسجد میں جانے کی بات تو بہت دور کی ہے، ہیئتِ نماز، سجدہ کا طریقہ، رکوع کا طریقہ، ہاتھ باندھنے کا طریقہ، قعدہ میں بیٹھنے کا طریقہ، آخر کیوں آپ لوگ فرق کرتے ہیں کہ مرد اس طرح بیٹھے، عورت اس طرح بیٹھے ؟ دراصل ذہن کا سانچہ ہی بدل گیا ہے، سوچنے سمجھنے کے انداز تبدیل ہوگئے ہیں، غور و فکر کے پیمانے ہی میں تغیر آگیا ہے، ایک غلط سوچ پر غلط نظریات کی عمارت تعمیر ہورہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لیے ستر اور حجاب کا خصوصی قانون رکھا ہے، اسی لیے نماز میں عورتوں کے لیے اسی ہیئت و کیفیت کو ترجیح دی گئی ہے جس میں نسبتاً زیادہ ستر ہے، یورپ نے کیا کیا؟ مرد کو فل سوٹ پہنایا اور عورت کو ننگا کر کے بازار میں گھمایا، آپ میں سے کوئی جائے گا تو یہ تماشہ اس کی نظر سے دس بار گذرے گا، نہ موسم کا اس پر کوئی اثر ہے، نہ کسی اور چیز کا۔ یاد رکھئے! اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتے ہیں اور عدل کے معنی ہیں ہر شئ کو اس کے مناسب اس کا حق ادا کرنا، ہر شئ کی جو حقیقت ہے، جو اس کے تقاضے ہیں، جو اس کی اصل فطرت کے مناسب ہے، وہ ذمہ داری سونپنا اور صحیح حق حقدار تک پہنچادینا، یہ دراصل عدل ہے۔ اسی لیے مرد یعنی شوہر (میں لفظِ شوہر خاص کر کے بول رہا ہوں، اس لیے کہ مرد بیٹا بھی ہے، باپ بھی

ہے اور شوہر بھی ہے، لیکن جب مردوں اور عورتوں کی بات چلتی ہے، تو لوگ زندگی کے تمام دوسرے رشتوں کو بھول جاتے ہیں، وہ ماں جس کے پیروں تلے جنت رکھی گئی ہے، وہ بہن جس کی عزت و آبرو کا محافظ بھائی کو بنایا گیا اور وہ بیٹی جس کی بہت بڑی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے اور جس کی محبت کے ساتھ پرورش کو جنت کی ضمانت قرار دیا گیا ہے، ان سب کو لوگ فراموش کر جاتے ہیں۔) پر ذمہ داری رکھی کہ تم کو کمانا ہے، تم ”قوام“ اور گھر کی ذمہ داری کے کفیل ہو، تم جاؤ کماؤ، عورت کی کفالت کرو۔ یہ بات چاہے ہماری بہنیں کتنی ہی ناپسند کریں، لیکن یہی فطرتِ انسانی کا تقاضہ ہے۔ جس معاشرہ میں عورتوں نے اس اصول سے انحراف کیا ہے وہاں عورتوں کی زبوں حالی کھلا ہوا واقعہ ہے۔ مرد نے جب عورت کا استحصال کیا اور اس کو اس کے جائز حقوق سے محروم کیا تو مرد نے عورت کو فیکٹریز میں پہنچا دیا اور خود ریٹائر منٹ لے کر بیٹھ گئے، سوشیل سیکوریٹی کا پیسہ کھا رہا ہے، غرض مرد اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ رہا ہے، عورت بہت خوش کہ میں کمانے لگی، اس نے یہ نہیں سمجھا کہ بچوں کی پرورش کون کرے گا؟ اب بچوں کے لیے گھر تلاش کیا جانے لگا، غیر عورتوں کے ہاتھ میں ہمارے بچے ڈال دیئے گئے، یہ مغربی تہذیب کی وہ مصیبت ہے کہ بچوں کو ماں کا پیار نہیں مل پاتا اور کتنی ہی زبردست کرایہ پر لائی ہوئی عورت ہو وہ بچوں کو ماں کی شفقت اور ماں کا پیار نہیں دے سکتی، اس کو کوئی بھی عورت اپنے کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر سمجھ سکتی ہے، کوئی غیر نہیں دے سکتا اگر ماں نہیں دیتی، نتیجہ یہ ہے کہ آنے والی نسل برباد ہو رہی ہے، وہ منشیات میں اور گانے بجانے میں لگ رہی ہے، وہ ہپی بن رہی ہے، مگر اس کا کوئی غم نہیں۔

میرے عزیز دوستو! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مسلمان ہونے کی قید نہیں، مجھے یقین ہے کہ از انی نسل کی اس بربادی پر اگر آنکھ میں آنسو آسکتے ہیں، تو حضور اقدس ؐ کے آسکتے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے جس ہمدردی، خیر خواہی اور انسانیت کی دنیا و آخرت کی فلاح و بہبودی کی بات کہی ہے، وہ ساری کائناتِ انسانی کے لیے ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے دستر خوان بچھایا ہے، بلایا ہے سب کو، کوئی آیا اور کوئی نہیں آیا، نہیں آنے والوں کی فلاح کے لیے بھی ہمارے آقا پریشان ہیں۔ صلی اللہ علی سیدنا محمد۔ آج ہندوستان کی ہزاروں بیٹیاں تلک اور جہیز کی رسموں میں جلائی جا رہی ہیں، یہ جلائی جانے والی بیٹیاں بھی اس طرح جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ہیں، جس طرح فاطمہ زہرہؓ بیٹی ہیں، جس طرح آپ کے گھر کی کوئی خاتون حضورؐ کی بیٹی ہے، حضورؐ کا غم سب کے لیے ہے، حضورؐ کا دکھ سب کے لیے ہے۔

پس یہ انسانیت اس کی محتاج ہے کہ عدل کے وہ اصول جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے ہیں، ان کو دنیا میں رائج کیا جائے۔

قرآن میں "میزان" سے مراد

قرآن نے کئی جگہ اس کو میزان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ الرَّحْمٰن o عَلَّمَ الْقُرْاٰن o خَلَقَ الْاِنْسَان o عَلَّمَهُ الْبَيَان o الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَان o وَ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدَان o وَ السَّمَاءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِيْزَان o (الرحمٰن :۷-۱) ٹھیک ہے وہ میزانِ عدل جس پر اعمال آپ کے تولے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے سورج چاند پیدا کیا اور سورج اور چاند کی ہر رفتار کو کسی باریک سے باریک الیکٹرانک آلات یا ترقی یافتہ کمپیوٹر نے جس طرح باندھا ہو، اس سے بہتر طور پر باندھ دیا۔ اس کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے ابھی علم و تحقیق کے میدان میں اور آگے بڑھنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے کس قدر زبردست باریک بینی کے ساتھ سورج اور چاند کی رفتار کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا ہے، انسان نے کچھ پیدا نہیں کیا ہے لوگو! نہ سائنس نے کچھ پیدا کیا ہے، سائنس نے صرف پیدا کی ہوئی چیزوں پر سے پردہ اٹھایا ہے، سائنس کا مقصد و مصرف ہی یہی ہے۔ ہمارے دوست ایک کتاب لائے اور سائنس کے کرشمے بتائے اور خود انہوں نے کہا کہ نام اس کا "قدرت کے کرشمے" ہونا چاہیے اور صحیح کہا، سائنس کوئی کرشمہ نہیں کرتی، سارا کرشمہ تو قدرت نے کر رکھا ہے، سائنس کو سربسجود ہو جانا چاہیے، کہ قدرت کے ان رازوں کے کسی حصہ کی یافت ان کو ہو گئی ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے، کہ "مَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا" یعنی تم نے جتنا بھی جان لیا ہو، لیکن جو جانا ہے وہ کم ہے اور جواب تک نہیں جانا ہے وہ کہیں زیادہ ہے، تجسس و تحقیق جو کام ہے تمہارا وہ کرو۔

تخلیق کائنات میں توازن

خدا نے اپنی رحمانیت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس نے قرآن اتارا اور قرآن کا علم دیا، انسان کو پیدا کیا اور انسان کو قرآن کا علم دیا، اور انسانیت کو اپنے اندر کی بات ظاہر کرنے کی صلاحیت دی، سورج چاند کو بالکل حساب سے پیدا کیا، بیلیں اور کھڑے درخت، وہ بیلیں جو انگور کی بیل، پھولوں کی بیل جو ٹٹیوں پر پھیلتی جاتی ہیں اور وہ درخت جو تنوں پر کھڑے ہیں، یہ سب اسی کے سامنے سربسجود ہیں، آسمان کو بلند کیا اور ایک میزان رکھ دیا ہے، اس پوری کائنات میں ایسا ترازو رکھا جو تولتا ہے پوری چیزوں کو۔ جی چاہتا ہے اور ڈر بھی لگتا ہے کہنے میں دوستو! کہ شاید میزان سے یہ مراد ہو کہ عالم تکوین

میں قدرت نے جو تخلیق کیا ہے اور جو کچھ پیدا کیا اور بنایا ہے اس میں بیلنس رکھا ہے، سورج اور چاند کی رفتار میں سورج کی حرارت میں، ان درختوں کی تخلیق میں، کائنات کے ذرّے ذرّے کی پیدائش میں ایک خاص بیلنس ہے۔ اگر وہ توازن باقی نہ رہے تو عالم تباہ ہو جائے۔

مجھے یاد ہے کہ ہندوستان کے ایک کابینی وزیر ہمارے گھر آئے، اس زمانے میں سیلاب بہت آیا کرتا ہے اور اسی نے بہار کو برباد کر رکھا تھا، انہوں نے کہا کہ ہمارے جواہر لال نہرو تقدیر کو نہیں مانتے، بڑی زوردار تقریر کی، گاؤں کے لوگ بھی متاثر ہوئے، ان صاحب نے کہا کہ نہرو جی نے دریا پر بند ھ باندھ دیا ہے، نہریں بنادیں ہیں، جن سے تمام زمینیں سیر اب ہوں گی، اب بہار کبھی تباہ نہ ہوگا ، دو برس نہیں گذرا، کہ ان نہروں کے چاروں طرف کی زمین بیکار ہو گئی، کیوں کہ سطح آب اور Water Level وہاں اونچا ہو گیا، نہروں سے گذرنے والے پانی کے اس کے چاروں طرف سرایت کرنے کی وجہ سے سطح میں فرق آگیا، ہزار ہا ہزار ایکڑ زمین اس کے نتیجہ میں دلدل ہو کر رہ گئی اور جو بہترین فصل دیتی تھی وہ خراب ہو کر رہ گئی۔ جو لوگ تقدیر کو نہیں جانتے اور تقدیر کو نہیں مانتے اور اپنی تدبیر ہی پر آخری ایمان رکھتے ہیں، وہ دراصل خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ قدرت نے اپنی تخلیق میں کیا بیلنس رکھا ہے ؟ اس بیلنس کو جاننا بھی تو سائنس کا کام ہے، اس لیے کہ زمین کا واٹر لیول اگر بہت نیچے ہو جائے گا تو اس کے اوپر کوئی فصل نہیں آئے گا، جو بیج ڈالیں سوکھ جائے اور کچھ پیدا کرنے کے لائق نہیں رہے گی۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَا اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ کیسا وہ پیدا کرنے والا ہے اور کیسا اس کا توازن اور بیلنس ہے ہر شئی میں ؟؟ کہ درجۂ حرارت کیا ہونا چاہیے اور ٹھنڈک اور نمی کتنی ہونی چاہیے، اس کے مطابق ہی نمی اور حرارت ہوتی ہے۔

قدرت کی اس کار پر جتنا غور کریں کم ہے، خود انسانی جسم کی تخلیق میں کس قدر بیلنس اور توازن ہے، اگر ہر شئی صحیح توازن کے ساتھ نہ ہو تو انسان صحت سے محروم ہو جائے۔ میں اور ہمارے میر مقصود علی صاحب بیٹھے ہیں، ہم دونوں ذیابیطس کے مریض ہیں، یہ مرض اصل میں بیلنس ہی کے بگڑنے سے عبارت ہے، جتنی انسولین جسم میں پیدا ہونی چاہیے، جو زائد شوگر کو جلادے اور انسانی جسم کے لیے جتنی ضرورت شوگر کی ہے، اس کو باقی رکھے، اسی میں توازن ختم ہو گیا، اس لیے ہم لوگ بیمار ہیں اور انسولین کے مریض ہو چکے ہیں۔ اگر پوری انسانیت کو دیکھو گے تو اللہ تعالیٰ نے ہر شئی میں ایک بیلنس اور توازن رکھا ہے کہ ذرا وہ بگڑی تو کام ختم۔

تو جی یہ کہنے کو چاہتا ہے کہ عالم تکوین میں اللہ نے جو بیلنس رکھا ہے، عالم تشریع میں قرآن

کے ذریعہ تم کو وہی بیلنس اور توازن عطا کیا ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے کہ "اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ" کہ اس دنیا میں اندر اور باہر اور دنیا و آخرت کے اعتبار سے جو کچھ توازن و اعتدال اللہ کی قدرت سے موجود ہے اور حضورؐ کے لائے گئے دین کے ذریعہ دیا گیا ہے، اس میں تم حدود کو پار مت کر جانا اور اس توازن اور بیلنس کو ٹوٹنے مت دینا۔

اسلامی تعلیمات۔ سراپا عدل و اعتدال کی تصویر

میرے دوستو! اس اصول کو یاد کر کے آپ پورے اسلام کا مطالعہ کیجئے، چاہے اولاد اور ماں باپ کے حقوق کا مسئلہ ہو، میاں بیوی کے حقوق کا مسئلہ ہو یا جو کچھ بھی ہو، ہر مسئلہ کو آپ دیکھیں تو وہی اعتدال اور توازن ہر جگہ ہوگا اور جب بھی اعتدال کو چھوڑا جائے گا کام خراب ہوگا، مرد کو کہا گیا آپ بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کیجئے، مگر میرا اپنا خیال ہے کہ مرد پر ذمہ داری بیوی کے ساتھ صرف عدل کرنے کی نہیں ہے، بلکہ عدل سے بڑھ کر احسان کی ہے "اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ" ہر چیز کو اس کا واجب حق دینا تو عدل ہے اور حق سے زائد دینا احسان ہے۔ دونوں باتوں کا حکم دیا گیا اور شاید رشتہ داروں کے بارے میں کچھ اس سے زیادہ کی بات ہے، اسی لیے مستقل طور پر ان کا ذکر کیا گیا "اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی"، یا اسی عدل و احسان ہی کے مصرف کو مزید کھول کر بتایا گیا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے قرآن میں کہ جو اجمال ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کو اور واضح کر کے دہرایا جاتا ہے۔ بیوی کے معاملے میں میرا اپنا خیال ہے کہ صرف عدل کافی نہیں ہے، مرد پر ضروری ہے کہ وہ احسان بھی کرے، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا۔ احسان کے معنی ہیں حق سے زیادہ دینا، قانون میں جائے گا تو عدل کا مسئلہ ہے، لیکن زندگی کی استواری کے لیے احسان کی حاجت پیش آئے گی اور عجیب بات ہے کہ ملاپ میں بھی عدل اور انصاف اور احسان و بہتری کا حکم دیا گیا اور علاحدگی میں بھی یہی کہا گیا "فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ" رکھنا ہے بیوی کو معروف طریقہ کے ساتھ رکھنا، مروّج اور معروف دینی طریقہ ہو، جن کے ساتھ بہتر اور خوش گوار رشتہ قائم ہو، خدانخواستہ مجبوری میں چھوڑنا بھی پڑے تو اس میں بھی حسن ہونا چاہیے، احسان ہونا چاہیے؛ چنانچہ قرآن نے کہا: وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، بیویوں کے ساتھ بہترین معاشرت اختیار کرو اور حضورؐ نے فرمایا: خیر کم خیر کم لاهله و انا خیر کم لاهلی، تم میں سب سے بہتر آدمی وہ ہے جو اپنی بیوی کے حق میں بہتر ہو اور تم سب میں اپنی بیوی سے سب سے بہتر سلوک کرنے والا میں ہوں۔ یہ نمونے دے دیئے گئے۔

طلاق کے معاملہ میں اسلام کا اعتدال

اب یہاں پر دو صورتیں تھیں، مجھے ان حقوق کی تفصیل میں نہیں جانا ہے، صرف اصولی بات کہنی ہے، یا تو نکاح کے بعد کہہ دیا جاتا کہ کبھی طلاق نہیں ہو گی جو دیگر مذاہب کے لوگ کہہ رہے ہیں، یا تو یہ کہا جاتا کہ تم کو کھلی چھوٹ ہے کہ تم طلاق دیتے رہو، مگر وہی بیلنس اور اعتدال و توازن والی بات ہے، اگر یہ کہا جاتا کہ تم کبھی طلاق دے ہی نہیں سکتے، تو یہی ہوتا کہ معاذ اللہ مجبور اور کمزور عورت کو آگ میں جلا ڈالو، جیسا کہ ہمارے بھائیوں کے سماج میں ہو رہا ہے، یا ویسی کھلی چھوٹ جو یورپ میں ہے کہ اوّلاً تو اب آہستہ آہستہ وہاں شادیوں کا رواج ہی ختم ہوتا جا رہا ہے، کون اس جھگڑے میں پھنسے، مرد یہ سوچتا ہے کہ اس کی جنسی اور نفسانی و شہوانی خواہشوں کی تکمیل کے لیے بہت راستے ہیں، کیوں شادی کرے، اس لیے کہ اگر شادی کے بعد نہیں نبھی تو وہاں کے قانون کے مطابق اپنی آدھی کمائی عورت کو دینی پڑے گی، تو آہستہ آہستہ ازدواجی نظام، میرج سسٹم ہی وہاں ٹوٹ رہا ہے، یہ اسی بے اعتدالی کا نتیجہ ہے، بھی بے اعتدالی ادھر بھی بے اعتدالی ؛ مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "النکاح من سنتی"، نکاح میری سنت ہے، یعنی **Unmarried** کنوارا رہنا، بے شادی کے رہنا اور ایسی لائف گذارنا جو کنوارے پن کی ہو، غیر فطری زندگی ہے۔ اس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوارا نہیں فرمایا : وہ ایسا سماج، جہاں شادی ہو بیاہ ہو، ایک دوسرے کے حقوق کو جانا جائے اور ان کو ادا کیا جائے۔

طلاق کی گنجائش مجبوری کی حالت میں دی گئی، کہ اگر یہ نہیں دیا جائے تو جبر اور زبردستی کے ذریعہ یہ رشتہ باقی نہ رکھا جاسکے گا۔ اسی لیے خود قرآن نے طلاق کا طریقہ بتایا۔ " یا ایُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ وَ احْصُوْا الْعِدَّۃَ" (الطلاق : ۱) اس میں اتنی مہلتیں ہیں، کہ آدمی سوچ کر صحیح فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم نے اپنی سوچ کو نافذ کر کے بے محابا طلاق دے کر اللہ کی نافرمانی کر کے اس توازن کو توڑا ہے، اسی لیے ہم کو معاشرتی زندگی میں کئی مشکلات کا سامنا ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے طلاق کو بالکل ہی ممنوع قرار دیا، ہندو کوٹ میں لاکر گنجائش بھی دی، تو شرائط لگائیں، اب مصیبت ان کی یہ ہو گئی کہ اگر کوئی ہندو آکر اسلام قبول کر لے تو کیوں قبول کر لے؟ اصلاً تو اسلام پسند کرے تو قبول کرے، لیکن اب ہندوؤں میں اسلام قبول کرنے کی جو رَو چلی ہے، اس سے پریشان ہو کر خود سپریم کورٹ بھی متاثر ہو گیا اور اس نے یہ نہیں سوچا کہ جو فطری جبر تمہارے یہاں تھا، اس کی اصلاح تم کرتے، اس کے بجائے انہوں نے یہ کہا اگر مسلمان بھی ہو جائے تب بھی وہ اس کی بیوی

باقی رہے گی اور ایک خاص قانونی دفعہ کے تحت اس کے لیے جیل کی طویل سزا دینا طے کیا۔ دراصل جو اعتدال، توازن اور بیلنس قائم کیا گیا ہے، قانونِ شریعت میں اس کو جو جمیں اس کو جب بھی توڑا جائے گا، چاہے ہم توڑیں یا کوئی اور، نتیجہ میں معاشرہ میں فساد اور بگاڑ پیدا ہوگ

دولت کا ارتکاز

اب میں دوسروں کی طرف آتا ہوں۔ انسانوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ پیٹ کا ہے، معاشیات کا ہے، آدمی چاہتا ہے کہ ہم کو پوری آزادی ملنی چاہیے، ہم جیسے چاہیں، جتنے چاہیں کمائیں اور کماتے رہیں۔ اس کا سیدھا نتیجہ کیا ہوگا؟ ارتکازِ دولت ہوگا، دولت عام لوگوں سے سمٹ کر چند لوگوں میں محدود ہو جائے گی۔ خوب یاد رکھئے! عام لوگوں سے جو دولت سمٹ کر چند خاص لوگوں کے پاس چلی جائے، وہ دولت ہمیشہ دنیا میں فساد پیدا کرے گی، وہ اس بیلنس اور توازن کے خلاف ہے جو خود اس کائنات کے خالق نے پیدا کیا ہے۔ کیسے ہوتا ہے دولت کا ارتکاز؟ اس کو سمجھئے، اس کے لیے سب سے بنیادی حربہ "انٹرسٹ سسٹم" (سود کا طریقہ) ہے، سود کے ذریعہ ایک شخص روپیہ سے روپیہ کماتا ہے، روپئے تو وہ کسی پروڈکشن میں نہیں لگاتا، روپئے پر وہ محنت نہیں کرتا، روپے کے معاملے میں وہ کوئی خطرہ مول نہیں لیتا، ہر خطرہ سے پاک اور ہر ذمہ داری سے فارغ بغیر کسی محنت کے روپیہ کو بکھیر دیتا ہے اور ہر روپیہ اپنے ساتھ روپیہ لے کر چلا آرہا ہے، وہ یہاں بیٹھ کر صرف کوٹھی بنا کے بیٹھا ہے، سارے پیسوں کو جمع کرتا ہے، گئے تھے اس کے ایک لاکھ اور آئے ہیں ایک لاکھ بیس ہزار، یہ بیس ہزار کہاں سے آئے؟ یہ سارے لوگوں سے سمٹ کر آگئے، یہ دولت کو مرتکز کرنے کا راستہ ہے، دوسری صورت لاٹری اور جوا ہے، میں لاٹری قصداً بولا تھا کہ آپ سمجھ جائیں آسانی سے، لاٹری میں کیا ہوتا ہے، دس لاکھ کرناٹک کے بسنے والوں نے کرناٹک اسٹیٹ لاٹری میں دس دس روپئے دیئے ہیں، لیکن ایک کروڑ روپیہ انعام ان میں تقسیم ہوا اور وہ ایک کروڑ روپیہ دس سے بیس تک آدمیوں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے، اس طرح پھیلی ہوئی دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں جارہی ہے یا نہیں؟ یہ قدرت کے اس توازن کو توڑتا ہے؛ اس لیے جو پیغام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، اس پیغام میں سود اور جوے کو قطعی حرام قرار دیا گیا۔ یہ اس توازن کو توڑتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے معاش اور وسائل معاش اور کائنات میں قدرت کے پھیلائے ہوئے ذرائع اور ان سے استفادہ میں رکھا ہے۔ جوے کے ذریعہ معاشی نظام کی استواری نہیں رہ سکتی، جب تک جوا جاری رہے گا اور سود جاری رہے گا معیشت میں استحکام و توازن قائم نہیں ہو سکتا۔ آج ساری دنیا روتی ہے کہ انفلیشن ہے، افراطِ زر ہے۔

.....

برکت کی حقیقت

دراصل یہ افراطِ زر اس کائناتِ انسانی پر اللہ کے ایک عذاب کی صورت میں عائد ہے، لوگو! کاش آپ نے قرآن کو اور حضورؐ کی تعلیم کو سمجھا ہوتا، یہ اللہ کا عذاب ہے۔ ایک لفظ حضورؐ نے برکت کا استعمال کیا ہے، آپ بھی اس لفظ کو بہت بولتے ہیں، کہ برکت ہو گئی، دعا کر دیجئے کہ برکت ہو، یہ برکت ہے کیا، کچھ سمجھا ہے آپ نے؟ برکت یہ تھوڑا ہی ہے کہ کوئی چیز اوپر سے اترنے لگے، برکت یہ ہے کہ کم چیز میں زیادہ کام ہو جائے، چیز تھوڑی ہے، کام زیادہ لوگوں کا چل جائے، اس کو "برکت" اور اس کے مقابلے میں ایک لفظ ہے "محق"، محق سے مراد ہے کہ چیز زیادہ ہو اور کم لوگوں کا بھی کام نہیں ہو پائے۔ اسی معنی میں قرآن نے کہا کہ "یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا" (البقرۃ: ۲۷۶) سود اور سود کا پورا نظام محق کا باعث ہے، یعنی روپیوں کی تعداد بہت ہو گی اور اس سے حاصل ہونے والی چیزیں کم ہو جائیں گی، یہی تو انفلیشن ہے، روپیہ تو بہت بڑھ گیا، کرنسی بہت ہو گئی، لاکھوں کا ذخیرہ ہے، میں ابھی کل اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنے بچپن میں اپنے بزرگوں سے سنا، کہ وہ چھ سو روپیوں میں حج کر آئے تھے اور جب سنہ ۷۰ میں میں گیا ہوں تو اس وقت ۲۲۰۰ روپے خرچ ہوئے تھے، سنہ ۷۶ میں ۸۰۰۰ روپے خرچ ہوئے اور آج ۶۰۰۰۰ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ کیا ہوا یہ؟ یہ چھ سو یا بائیس سو کی رقم سنہ ۷۰ سے لے کر ۹۵ میں ۶۰۰۰۰ ہزار کیسے ہو گئی؟ روپیہ بڑھ گیا کام کم ہو گیا، روپیہ کی افادیت کم ہو گئی، روپیہ سے حاصل ہونے والی چیز کم ہو گئی، اس لیے کہ روپیہ نے پیداوار نہیں کیا، روپیہ نے ترقی نہیں کی، روپیہ نے یہاں کے پھیلے ہوئے خزانوں کو بڑھایا نہیں، روپیہ بڑھ گیا خزانہ گھٹ گیا، پروڈکشن کم ہو گیا روپیہ بڑھ گیا، دولت افراد سے سمٹ کر، جماعت اور قوم سے سمٹ کر چند افراد کے ہاتھ میں آ گئی، لہٰذا روپیہ بے برکتی کا شکار ہو گیا۔ اللہ کا فیصلہ ہے کہ سود اور سود کا سسٹم بے برکتی پیدا کرے گا، صدقات اور زکوٰۃ کا نظام اللہ نے مقرر فرمایا ہے، وہ تمہارے پیسوں میں اضافہ کرے گا اور برکت کا باعث ہو گا اور تمہاری دولت کی افادیت کو بڑھائے گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ دس جیبوں سے نکل کر وہ پیسہ لاکھ جیبوں تک گیا اور لاکھ انسانوں کو اس پیسے نے کام میں لگایا، اس سے پروڈکشن بڑھا، اس لیے چیزوں کے درمیان اور طلب اور رسد کے درمیان، مانگ اور پہنچ کے درمیان صحیح بیلنس قائم رہے گا۔ جب صحیح توازن قائم رہے گا تو پیسے کا دام بڑھے گا، تب پیسے کی وقعت بڑھے گی اور اس بیلنس کو توڑ دیا جائے تو یقین کرو کہ اس کی برکت ختم ہو جائے گی اور تمہارے یہاں افلاس آئے گا، زکوٰۃ میں پیسہ پھیلتا ہے لوگوں تک اور سود میں چند لوگوں تک پیسہ

سمٹ جاتا ہے۔ یہ بنیادی اور واضح فرق ہے۔ زکوٰۃ میں کمانے والا یہ سمجھتا ہے کہ جو میں نے کمایا ہے یہ سب میرا نہیں ہے "وَ فِیْ اَمْوَالِکُمْ حَقٌّ لِلسَّائِلَ وَ الْمَحْرُوْمِ" (الذاریات : ۱۹) تمہارے مال میں جو لوگ سائل ہیں، معاشی اعتبار سے محروم ہیں، ان کا حق ہے۔ تو اسلام میں اگر ایک طرف سود کو حرام قرار دیا تو دوسری زکوٰۃ عائد کیا، زکوٰۃ دونوں چیزوں کے درمیان توازن باقی رکھتی ہے، پس جب عام لوگوں تک مال پہنچے گا تو وہ اس میں اور طلب میں توازن پیدا کرے گا، ڈیمانڈ اور سپلائی میں بیلنس پیدا ہوگا اور معاشی توازن کا سارا راز یہی ہے، کہ طلب اور رسد کے درمیان توازن رہنا چاہیے، اگر ڈالر مارکٹ میں زیادہ آجائے اور اس کے طالبین کم ہو جائے تو ڈالر کا دام کم ہو جائے گا، اگر ڈالر کم آئیں اور طالب زیادہ ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کا دام بڑھ جائے گا۔ یہ معاشیات کا ایک ایسا کھلا ہوا راز ہے، جس کو ایک عام طالبِ علم بھی جانتا ہے۔

لاٹری

لاٹری نے آج ہمارے گھروں میں بڑا فساد پھیلایا ہے، عورت گھر میں معصوم بچوں کو لیے آنکھوں سے آنسو بہا رہی ہے اور صاحب اپنی کمائی آفس سے اور فیکٹری سے لا کر یا تو شراب کے ایک جام پر یا لاٹری کا ٹکٹ خرید کر برباد کر رہے ہیں، اس کے خون اور پسینہ سے کمائی ہوئی یہ دولت ان چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں جا رہی ہے۔ لوگ مجھ سے مسئلہ پوچھتے ہیں دو لاکھ مل گیا ہے، اس کو کیا کریں؟ تو خوب یاد رکھئے! یہ پتہ نہیں کتنے لوگوں کا مارا ہوا یہ حق اور مال ہے، اس کو شریعت کیسے جائز قرار دے سکتی ہے؟؟

زکوٰۃ

زکوٰۃ سماج کے کمزور اور نادار لوگوں کی مدد کا نہایت عظیم الشان نظام ہے، جس کی کہیں اور مثال نہیں مل سکتی اور اگر ہر مسلمان پابندی سے ادا کرنے لگے تو کوئی بھوکا اور بنیادی ضروریات سے محروم باقی نہ رہے۔

ہر شخص اپنی بچت، آمدنی، مالِ تجارت اور سونا چاندی میں ڈھائی فی صد ادا کرتا ہے، اگر جانور پال رکھے ہیں، جو افزائش کی غرض سے ہیں اور جانور سائمہ ہیں، جن کی تفصیلات کتابوں میں موجود ہے اور علماء سے دریافت کی جا سکتی ہے، تو پانچ اونٹ میں ایک بکری، تیس گائے میں ایک گائے اور چالیس بکریوں میں ایک بکری دینی ہے، زمین قدرتی طور پر سیراب ہوئی تو دس فیصد اور خود سیراب کرنی پڑی اور اخراجات کا بوجھ اٹھانا پڑا تو پانچ فی صد اس میں بھی واجب ہے، دولت کی دو قسمیں ہیں،

زمین کے نیچے کسی آدمی کا دفن کیا ہوا خزانہ ہو تو اس کو کنز کہتے ہیں اور قدرتی طور پر پیدا کیا ہوا ہو تو اسے معدن کہتے ہیں اور دونوں کو ملا کر رکاز کہتے ہیں، اگر کوئی شخص اپنی محنت سے کسی کان کی یافت کر لیتا ہے، یا کسی چھپے ہوئے خزانے کا پتہ چلا لیتا ہے تو اس کو بھی چھوڑا نہیں گیا اور اس میں بیس فی صد زکوٰۃ واجب قرار دی گئی۔ اسی طرح انفرادی کوششوں سے حاصل ہونے والی ہر دولت میں اجتماعی مفاد کا ایک شیئر تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ گویا "وَ فِیْ اَمْوَالِکُمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ" کی عملی صورت گری اور تطبیق ہے۔

نظامِ میراث

یہ تو زکوٰۃ و عشر کا نظام ہے، جو تقسیمِ دولت کا ایک اہم اور مؤثر ذریعہ ہے۔ اسلام سے پہلے دولت کے ارتکاز کا ایک بڑا سبب انسان کی موت کے بعد جائداد کی عدم تقسیم اور بڑے بیٹے کا پوری جائداد کا حقدار بن جانا تھا، یہی جائداد کے بارے میں عام تصور تھا، جو اسلام سے پہلے پایا جاتا تھا، بیٹیوں کے لیے تو میراث میں کوئی حق ہی مانا نہ جاتا تھا، بیٹے کو بھی ملے گا، بیٹی کو بھی ملے گا، بیوی کو بھی ملے گا، ماں کو بھی ملے گا، باپ کو بھی ملے گا اور بعض حالات میں بہنوں کو بھی ملے گا اور بعض حالات میں سوتیلے بھائی بہنوں اور بھتیجے کو بھی ملے گا۔ پوری آیت "یُوْصِیْکُمُ اللہُ الخ" (النساء: ۱۱) اسی پورے نظام کی تفصیل کرتی ہے اور یہ بتا دیتی ہے کہ وراثت کے ذریعہ بھی ارتکازِ دولت کے بت کو توڑ دیا گیا کہ دولت کسی ایک شخص کے پاس جمع نہیں رہ سکتی، اس کو تقسیم تو ہونا ہی ہے۔

ہمارے دوستوں نے جنہوں نے بنیوں کی ترقی دیکھی، وہ بڑے خوش ہو گئے، انہوں نے کہا کہ صاحب! کاش کہ ایسا ہی ہوتا، مسلمان کا مال تو ہمیشہ بٹ کے ختم ہو جاتا ہے، بیشک اسلام دولت کا ارتکاز نہیں چاہتا اور وہ جانتا ہے کہ جب دولت کسی ایک تالاب میں مرتکز ہو کر رہ جائے گی، تو وہ پانی سڑتا ہے اور اس کے فساد سے جو آب و ہوا بگڑتی ہے، تو پورے ماحول کو برباد کر دیتی ہے، اس خزانہ کے تعیش اور اس کے ذریعہ پورے سماج کے بگڑنے کی کہانی آپ کے لیے کوئی نئی کہانی نہیں ہو گی۔ قرآن نے ایک بڑے پتہ کی بات کہی ہے: "لَا تَدْرُوْنَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا" (کس شخص سے کس کو فائدہ پہنچنا ہے اور نہیں پہنچنا ہے اور کتنا پہنچنا ہے، نظامِ وراثت میں اس کا کسی کو پتہ ہو ہی نہیں سکتا) اس لیے کہ نظامِ وراثت موجودہ لوگوں کی طرح نہیں، جہاں مالک کی زندگی میں حصہ دار بنا دیا گیا، بلکہ نظامِ وراثت کو شریعت نے مورث کی موت پر موقوف کر دیا اور مورث کی موت کب ہو گی کسی کو معلوم نہیں اور جس دن مورث کی موت ہو گی اس دن کون موجود رہے گا، اس کا بھی کچھ علم نہیں،

اس لیے اہل قرابت میں جو ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کا جذبہ ہے، وہ بھی وراثت اور حصہ داری کی لالچ میں نہیں ہوگا، اللہ کی رضا کے لیے ہوگا، کوئی بیٹا نہیں جانتا کہ مجھے باپ سے ملے گا کہ نہیں ملے گا۔ یہ جو تاریکی ہے کہ کس کو ملے گا اور کب ملے گا مورث کی موت پر موقوف کر کے شریعت نے اس چیز کو پردۂ خفا میں ڈال دیا اور اس تعلق کو بے غرضانہ بنا دیا، وراثت کی لالچ میں اب خدمت نہیں ہوگی اللہ کی رضا کے لیے خدمت ہوگی، جس کو وراثت ملنی ہے مل کر رہے گی، انشورنس بیوی کے نام پر کرالیا، انشورنس میں یہ واقعہ پیش آتا رہتا ہے، کہ میاں نے دیکھا کہ اس بیوی سے محبت نہیں رہتی اور اس کے انشورنس سے فائدہ اٹھانا ہے، لہٰذا کسی نہ کسی ترکیب سے اس کو مروادو، کبھی بیوی نے میاں کے خلاف سازش کی، کبھی بیٹے نے باپ کے خلاف سازش کی، اگر وراثت کے لیے یہی بات پیش آئے کہ بیٹا چاہے کہ میں جلدی باپ کے مال کا قابض بن جاؤں اور وہ باپ کو قتل کرادے تو کیا ہوگا؟ اس کے لیے بھی شریعت نے قانون بنا دیا: ”من استعجل الشیئ قبل اوانہ عوقب بحرمانہ“ جس شخص نے آنے والے وقت میں ملنے والے مفاد کو حاصل کرنے میں عجلت کر دی، اس کو جلدی حاصل کرنے کی کوشش کی، اس کو یہ سزا دی جائے گی کہ وہ اس فائدے سے محروم کر دیا جائے گا؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”القاتل لا یرث“ قاتل وارث نہیں ہو سکتا، یعنی مورث کا قاتل اس کا وارث نہیں ہو سکتا، بہر حال خلاصہ یہ ہے کہ قانونِ وراثت کے ذریعہ دولت کو تقسیم کیا گیا۔

کبھی لوگ ایسا سوچتے ہیں کہ لڑکی کی شادی ایسی جگہ کر دیں کہ دولت باہر نہ جائے، کروڑوں روپیہ کی دولت ہے، بیٹی کا بیاہ دوسری جگہ ہو جائے گا، تو اب دوسرے تیسرے خانہ میں میرے گھر کی دولت چلی جائے گی، حالانکہ قرآن نے کہا ہے کہ ایک لڑکی اگر کہیں رشتہ پسند کرتی ہے تو اس کو تم روک نہیں سکتے ہو کہ وہ اپنا نکاح وہاں نہ کرے۔ دولت کو روکنے اور گھر میں بند کرنے کی لالچ ایسا رذیلۂ نفس ہے، جو بڑے بڑے اصحابِ تقویٰ کو بھی معاف نہیں کرتی۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ لیکن اسلام اس کے لیے تیار نہیں ہے کہ تم کسی عورت کو محض اس لیے اس کو پسندیدہ رشتے سے روک دو کہ تمہاری دولت باہر نہ جائے، اگر وہ روکتا ہے تو وہ ظالم ہے اور رفع ظلم فریضۂ قاضی ہے، اس لیے قاضی ولی بن کر اس کا نکاح کر دے گا۔ کیا قانون کی وسعتیں ہیں! ایک ایک فتنہ کے دروازے کو بند کیا گیا ہے۔

وصیت

دولت مرتکز کرنے کا ایک ذریعہ ”وصیت“ ہو سکتا تھا، میں وصیت تو کر سکتا ہوں، تو میں

وصیت یہ کروں گا کہ میری کل جائداد کا بڑا بیٹا مالک ہوگا، اس طرح قانونِ وراثت کو منسوخ کر دوں گا ، لیکن اس دروزاہ کو بھی بند کر دیا گیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا : لا وصیۃ لوارث (وارث کے لیے کوئی وصیت معتبر نہیں) اچھا ممکن تھا کہ کسی اور سے محبت و تعلق کی بنا پر پوری جائد کی وصیت اس کے لیے کر جاتا، لیکن اس کی بھی گنجائش نہیں رکھی گئی اور اصول مقرر کر دیا گیا کہ ایک تہائی سے زیادہ وصیت کا اعتبار نہیں۔ اس طرح وصیت جو آج یورپ میں رائج ہے، دولت کے ارتکاز کو باقی رکھنے کا ذریعہ اور اس کے ذریعہ دولت کے بٹوارے کو روکا جاسکتا ہے۔ اسلام دولت کی تقسیم اور گردش کا قائل ہے ،اس لیے اس نے ہر جگہ ایسے دراوزے کو بند کر دیا ہے۔ اگر آپ اسلام کا اجتماعی مطالعہ کریں گے تو اس کا ہر ہر جز ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے اور جب اس کی خلاف ورزی کریں گے تو وہی حال ہوگا، کہ جب ایک تار ٹوٹتا ہے تو پورے کے پورے تار ٹوٹ جاتے ہیں۔ پس قانونِ وصیت میں جو تحدیدات اور پابندیاں عائد کی گئی ہیں، وہ اسلام کے نظامِ معیشت اور معاشی تصورات سے گہرا ربط رکھتی ہیں۔ یہی اعتدال ہے، یہی بیلنس ہے، یہی توازن ہے۔ اتنا نہیں دوستو! اسلام نے قدم قدم پر ایسے اصول مقرر کیے ہیں جن سے معیشت میں حلال اضافہ ہو، دولت کا فائدہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے اور معیشت ضائع نہ ہو، شراب کو روک دیا، اس لیے کہ شراب عقل کو ختم کرتی ہے اور اس حالت میں آدمی دولت کا صحیح استعمال بھی نہیں کر سکتا اور شراب سے گھر کے نظام میں بھی فساد و بگاڑ آتا ہے، پچاس فی صد سے زیادہ طلاق کے واقعات نشہ ہی کی وجہ سے ہوا کرتے ہیں۔ یہ نشہ کی حرمت بے معنی نہیں (معاذاللہ) یہ دراصل پورے سماج کو بچانے کا ایک راستہ ہے۔

عزیز دوستو! سودی نظام کی تائید کرنے والوں کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ بہت سے لوگ قرضوں کے مارے پریشان رہتے ہیں، وہ کیا کریں؟ کاش کہ ہم اسلامی بیت المال زندہ کر سکتے اور اسلامی نظام جاری کر سکتے تو ہم لوگوں کو عملاً یہ بتا سکتے کہ شریعت نے پورا اور مکمل سسٹم رکھا ہے، قرض کے بوجھ تلے لوگوں کو قرض سے نجات دلانے کے لیے، اسی لیے مصارفِ زکوٰۃ میں ایک مستقل مد "وَالْغَارِمِیْنَ" کی ہے، جو لوگ کسی جرم کی وجہ سے کسی تاوان میں پڑ گئے ہوں یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہوں ان کو قرض کے بوجھ سے نجات دینے کے لیے اسلام نے ایک اجتماعی نظام بنایا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں دس برس گذارے، یہ تدریجاً احکام شریعت کے نزول کا زمانہ ہے، جنگوں سے بھی چھٹی نہیں ہے، دشمنوں کے خطرے سے بھی مہلت نہیں، آخری تھوڑی سی مہلت ملی جس میں اطمینان سے اسلامی نظام کو قائم کرنے کا کام ہوا ہے، ڈھائی برس سیدنا

ابو بکر صدیقؓ کا عہدِ خلافت ہے اور غالباً دس برس سیدنا عمرؓ کا عہدِ زریں رہا، اس کے بعد سیدنا عثمان غنیؓ آتے ہیں، پھر حضرت علیؓ کا زمانہ آتا ہے، حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دو سال اور خلافتِ راشدہ کے تیس سال کی مدت ہے، جس میں اسلامی خطوط پر سماج کی تشکیل ہوئی، معیشت کو غیر سودی بنایا گیا اور اسلام کے پورے نظام کو بتدریج نافذ کیا گیا۔

زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کے اجتماعی نظام میں ایسی خیر و برکت اور معاشرہ کی فلاح ہے کہ سیدنا عثمان غنیؓ کا عہد آتے آتے یہ نوبت آئی کہ اب مستحق زکوٰۃ کو تلاش کرتے پھرو، کوئی زکوٰۃ کا مصرف نہیں ملتا تھا، تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ اب آپ لوگ خود ہی ادا کر دیا کیجیے، حکومت یہ ذمہ داری آپ کو تفویض کرتی ہے۔ صرف چند برسوں میں اتنا بڑا معاشی انقلاب آیا اور اتنا بڑا عملی تجربہ اس کا ہو چکا ہے۔

موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے بوجھ تلے دبا ہوا انسان

آج امریکہ بہت دولت مند کہلاتا ہے، لیکن ایک لطیفہ وہاں کے دوستوں نے مجھے سنایا کہ ہم بہت دولت مند ہیں، لیکن نہ گھر میرا، نہ گاڑی میری اور نہ کوئی سامان میرا، یہ فریج ہمارا نہیں، یہ ٹی وی ہمارا نہیں، یہ اعلیٰ درجہ کے فرنیچر جو گھر میں نظر آتے ہیں، ہمارے نہیں، یہ جو کاریں لگی ہیں دروازے پر یہ بھی ہماری نہیں، یہ سب سودی بینکوں کے ذریعے سود پر لیا ہوا مال ہے، سوائے میری جان کے اور کوئی چیز ہماری نہیں۔ ممکن ہے دس بیس لوگوں کا حال اس سے مختلف ہو، لیکن وہاں کے عام شہریوں کا یہی حال ہے، زندگی بھر وہ کولہو کے بیل کی طرح جتا رہتا ہے، کماتا ہے اور کما کر بینکوں کو سود ادا کرتا رہتا ہے۔ اس سرمایہ دارانہ نظام کی آج کل تعریفیں کی جاتی ہیں اور اس کو معاشی مسائل کا حل تصور کیا جاتا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور کی معاشی حالت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ سے لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر کسی کے پاس ایک ہی کپڑا ہو تو وہ نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ”او یجد کل منکم ثوبین“ کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس ایک جوڑا کپڑا ہے؟ یعنی ان کی معاشی حالت ایسی تھی کہ سب لوگوں کے پاس دو کپڑے نہیں تھے، بہتیروں کے پاس صرف ایک کپڑا تھا جو کمر سے بہ طرزِ تہبند باندھ لیا جاتا تھا۔ پس جب سماج کی معاشی حالت یہ تھی کہ جس کے رسولؐ نے بھر پیٹ مدینہ میں رہ کر روٹی نہیں کھائی اور جس کے خلیفۂ وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ کو چند پیسے روزانہ طے کیے گئے تھے، ان کی بیوی جب شکایت کرتی ہیں کہ بہت دن ہو گئے، بچوں نے کوئی میٹھی چیز نہیں کھائی، کچھ انتظام کیجیے، بچوں کو میٹھا پکا کے کھلا دوں، تو ابو بکرؓ کہتے ہیں کہ مجھے جو روزانہ

بیت المال سے ملتا ہے، اس سے زیادہ تو میں لا نہیں سکتا، اسی میں کھلانا ہو تو کھلاؤ، بیوی نے اپنا، بچوں کا اور حضرت ابو بکرؓ کا پیٹ کاٹ کاٹ کر کچھ پیسہ بچایا اور پیسہ دیئے کہ اس کا سامان لا دیجئے بازار سے، کہ بچوں کو میٹھا پکا کر کھلا دوں، حضرت ابو بکرؓ نے وہ پیسہ لیا اور بیت المال میں جمع کر دیا اور فرمایا کہ آج سے میری تنخواہ میں اتنا کم کر دو، کیوں کہ معلوم ہوا کہ اتنا کم بھی رہے تو میں جی سکتا ہوں۔ مجھے ابھی اس واقعہ کو بیان کرنا مقصود نہیں تھا، صرف اتنا بتانا تھا جو خلیفۂ وقت ہے اس کی معاشی حالت یہ تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کا قصہ آپ کو کل سنا چکا ہوں۔ وہ قوم جس کی معاشی حالت اتنی دگر گوں تھی، صرف چند برسوں کے بعد اسلام کے اس نظام کی برکت سے جس نے سود اور جوے کو حرام کیا اور زکوٰۃ کے نظام کو رائج کیا، دنیا نے دیکھا کہ اب لوگ زکوٰۃ لے کر گھومتے پھر رہے ہیں، کہ کوئی مستحق اور محتاج ملے جس کو ہم دے کر اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہوں۔

تو یہ محض ایک نظریہ نہیں، بلکہ وہ نظریہ ہے، جو اس زمین پر روبہ عمل آچکا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر سمجھ میں نہیں آئے تو کیا کیا جائے؟؟ یاد رکھئے گا! "عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" اور "وَضَعَ الْمِیْزَانَ" کے درمیان ایک عظیم رشتہ ہے، اس پر ہمیشہ دھیان رکھئے۔

خلقِ نبوی

میرے بزرگو! اب چلتے چلتے جب کہ ہماری یہ مجلس آخری سانس لے رہی ہے، بس چند منٹ کے لیے ایک خاص موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہوں، بہت اہم موضوع ہے، جو پانچ نہیں شاید دس خطبات میں بھی پورا نہ ہو اور وہ ہے "اخلاقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم" اس لیے کہ آپؐ کے بارے میں خود ارشادِ ربانی ہے: "اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" (اے رسول! آپ عظیم تر اخلاق کے مالک ہیں) اور چوں کہ بہت سے اصحابِ فکر و نظر یہاں موجود ہیں، تو کہنے میں تھوڑا لطف بھی آتا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ "تخلقوا باخلاق اللہ" اللہ کی عادتیں، اللہ کا خلق اختیار کرو، بندے اور اللہ کا خلق اختیار کریں، کتنا مشکل کام ہے؟ محققین علماء نے لکھا ہے اور جس کی طرف میں کل اشارہ کر چکا ہوں کہ ہر خلق محمدی کا سرچشمہ کوئی نہ کوئی اسم الٰہی ہے۔ "صلی اللہ علی سیدنا محمد" یہ اسماءِ حسنہ جو اللہ کے ہیں، ان ہی اسماءِ حسنہ کے سرچشمہ سے خلقِ محمدی کا پیکر ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اللہ کی صفت تو بندوں میں آہی نہیں سکتی، کیسے آئے گی، کوئی سوال نہیں، لیکن تخلقوا باخلاق اللہ کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ قوت و صفت جو انسان میں ہے اس کا مرکزی سرچشمہ اللہ کی ذات کی کسی نہ کسی صفت سے جڑتا ہے، اللہ رحیم ہے، اس سے رحمت بندے میں آتی ہے، اللہ عادل ہے اور عدل بندے میں آتا ہے

اللہ رقیب ہے، ہر چیز کے لیے نگراں ہے، کوئی چیز گڑ بڑ نہیں ہونے پائے، شافی ہے، بندہ شفا نہیں
ے سکتا، لیکن ان دواؤں کو تلاش کر سکتا ہے جس کو اللہ نے کسی بھی مرض کے لیے پیدا کر رکھا ہے،
س لیے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَخْلُقْ دَاءً اِلَّا خَلَقَ لَہٗ دَوَاءً، اللہ نے کوئی ایسی بیماری نہیں پیدا کی ہے، جس
ی دوا پہلے سے پیدا نہ کر دی ہو، اب تلاش و جستجو یہ بندے کا کام ہے، پس اللہ کے اسماءِ حسنہ سے خاص
شتہ ہے اخلاقِ محمدی کا، اور ہم سے اور آپ سے بھی مطالبہ ہے کہ تم خلق محمدی کو اختیار کیا کرو، کہا
گیا ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (زمین والو پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم
کرے گا) بہر حال دوستو! پھر کبھی اللہ نے کسی اللہ کے بندے کو موقعہ دیا تو آپ کو ان کی تفصیلات
بتائے گا، میں اس وقت صرف ایک بنیادی بات بتانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں جو اخلاق پھیلا ہوا ہے، یا
مغرب کے اخلاق کی جو بنیادیں ہیں، اس نے اور اسلام میں اور حضورؐ نے جو اخلاق دیا ہے، اس میں
بنیادی فرق کیا ہے؟ موضوع بہت ہی گہرا ہے اور طویل گفتگو چاہتا ہے، لیکن میں صرف چند اشارے
کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں۔ مغرب نے کہا: کہ اخلاق پیدا ہوتا ہے دو نظریوں سے، لذتیت یا
افادیت سے۔ نظریۂ افادیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ شئ جس میں فائدہ محسوس ہو وہ اچھی چیز ہے اور
خلق کی بنیاد اس پر ہونی چاہیے، کسی نے کہا کہ جذباتیت پر بنیاد ہے، کسی نے کہا کہ ضمیر صادق پر بنیاد
ہے اور کسی نے کہ عقل پر بنیاد ہے، کسی نے کہا کہ فطرت پر بنیاد ہے، افادیت والوں نے خلق کے
تنے الگ الگ معیار بنائے کہ آپ کے ساتھ ہنس کر بات کرنے میں فائدہ ہے تو آپ سے ہنس کر ملنا
خلاق ہے اور آپ کے ساتھ ہنس کر بات کرنے میں فائدہ نہیں ہے تو ہنس کر ملنے کی ضرورت نہیں
، آپ بڑے سرمایہ دار اس شہر کے ٹھہرے، پتہ نہیں کب کیا کام آپ سے لے لیں گے، تو میں نے
کھڑے ہو کر آپ کو گلے لگایا، اگر کوئی معمولی آدمی آیا تو سوچا کہ ان سے میرا کیا مفاد؟ خود ان ہی کو ہم
سے دس بار کام رہتا ہے، میں اس کے لیے کیوں کھڑا ہوں، یہ افادیت اور مفادات کی بنا پر انسانوں کے
رمیان فرق کرنا اور اس کو برتنا خود غرضی پیدا کرتا ہے۔ اسلامی اخلاق کی بنیاد ایثار پر ہے، اپنی
ضرورت کو دوسری کی ضرورت پر قربان کرنے کا نام ایثار ہے "یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ
بِهِمْ خَصَاصَةٌ" اسلام کہتا ہے کہ بیشک انسانی فطرت میں اللہ نے خیر اور شر کی تمیز رکھ دی ہے، اسلام
س بات کو مانتا ہے کہ خیر اور شر اچھے اور برے کی تمیز خود انسان کی فطرت میں موجود ہے، اس کو تم
فطرت کہو، ضمیر کہو یا عقل کہو۔

علم الاخلاق کے لیے بھی وحی الٰہی ضروری

لیکن یاد رکھو کہ جو کچھ فطرتِ انسانی میں رکھا ہوا ہے اس کو صحیح طور پر استعمال کرنے اور غلط راستے سے بچانے کے لیے وحی الٰہی کی ضرورت ہے۔ ”فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا“ اللہ نے نفس کو پیدا کیا اور اسے پیدا کرنے کے بعد انسان کے باطن میں انسان کے اندر فجور اور تقویٰ اور نیک و بد کی تمیز اللہ نے اپنے طور پر الہام پیدا فرمادیا، فطرتِ انسانی میں خیر و شر کی تمیز اور اس کی پہچان ڈال دی، لیکن عقل عیار ہے، سو حیلے بنالیتی ہے، کبھی جذباتیت، کبھی لذتیت، کبھی عقل کی غلط تصویر۔ انسان کے اس فطری احساس نیک و بد کو متاثر کردیتی ہے اور آدمی غلط راستے پر چلتا چلا جاتا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ نبی اور وحی الٰہی ایک چوکیدار بن کر تمہارے سامنے رہے جو فطرتِ انسانی کو حقیقی اور اللہ کی طرف سے ڈالے ہوئے احساس کو بگڑنے نہیں دے اور شاید یہی اشارہ ہے اس حدیث میں کہ جب بندہ اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور جذباتیت سے مغلوب ہوکر ایک بار گناہ کرتا ہے، تو قلب پر ایک کالا نقطہ پیدا ہوجاتا ہے اور گناہوں کے تسلسل اور اصرار سے یہ نقطہ پھیل کر پورے دل پر چھا جاتا ہے، پھر احساسِ خیر و شر اور تمیز نیک و بد اس دل سے مٹ جاتی ہے، اب ضرورت ہے کہ اس کو کھرچا جائے، اس کو گھسا جائے اور اس کے اوپر چھائی ہوئی سیاہی دور کی جائے۔ یہ وہی کرسکتا ہے جس کی شان یہ ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے، ”هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ“ (الجمعۃ : ۲) ”وہ اللہ ہی ہے جس نے بھیجا ایک رسول، اس رسول کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کی آیتیں تلاوت کرکے سناتا ہے، وہ انسانوں کے دلوں کو مانجھتا ہے اور وہ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے“ پس لوگو! تمہاری فطرت میں چھپا ہوا احساسِ گناہ اور احساسِ خیر و شر اور احساسِ نیک و بد بہت مبارک سرمایہ ہے، جو تمہارے سینہ میں اللہ نے پہلے سے رکھ رکھا ہے، اب وحی محمدیؐ، خلق نبویؐ، حضورؐ کی لائی ہوئی تعلیمات اور حضورؐ کے پیش کیے ہوئے عمل اور آپؐ کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق زندگی گذاریں۔ یقین ہے کہ اس سے تمہاری دنیا بھی سنورے گی اور آخرت بھی۔

☆☆☆

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کی روشنی میں

پروفیسر خلیق احمد نظامی

پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم نے اپنا یہ مقالہ مدراس کے جلسۂ سیرت النبی میں پیش کیا تھا۔ نظامی صاحب کے اس مقالہ پر مولانا عبد اللہ عباس ندوی نے درجِ ذیل نوٹ لکھا ہے :

"سیرتِ پاک پر ایک وقیع مقالہ علمی لحاظ سے ایک قیمتی دستاویز بھی ہے اور جذباتِ نیاز مندی و فدویت کا ترجمان بھی۔ حسن اتفاق کہیے یا شہر مدراس کی خوش قسمتی کہ یہ خطبہ بھی اسی شہرت سے منسوب ہو رہا ہے، جس سے سیرت نگارِ نبوی مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خطبات کی شہرت ہے۔ خطباتِ مدراس کی اہمیت کا اندازہ شام کے صاحبِ قلم ادیب و مؤرخ پروفیسر راغب الطباخ کے اس جملے سے ہوگا:" پورے اسلامی لٹریچر میں ایک فتح باب ہے۔"یعنی سیرت پر کام کرنے کا ایک نیا راستہ ان خطبات نے کھول دیا ہے۔ خلیق صاحب نے اپنے منفرد اسلوب میں سیرتِ پاک کا حسین مرقع بنا رکھا ہے، جو ایک طرح کا سپاس نامۂ عقیدت ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دربارِ رسالت میں کھڑے عرض کر رہے ہیں ۔

خوشا دردے کہ درمانش تو باشی   خوشا راہے کہ پایانش تو باشی"

سیرتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھنے کا جب ارادہ کیا تو کانوں میں بے اختیار مولانا شبلی کی رباعی گونجنے لگی ۔

فرشتوں میں یہ چرچا تھا کہ حالِ سرورِ عالم   دبیرِ چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامین لکھتے

صدا یہ بارگاہِ عالمِ قدوس سے آئی کہ ہے اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور جذبات و محسوسات کے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچ گ
علمی بے مائگی اور بے بضاعتی کے احساس نے ہمتوں کو پست اور ارادوں کو مضمحل کر دیا کہ جو ادب
عرش سے زیادہ نازک تر ہو، جہاں جنیدؒ اور بایزیدؒ کے حواس گم ہو جائیں، جہاں "جنبش لب خارز
آہنگ خطا ہو"، ایک عصیان کار کس منہ سے حاضری کا ارادہ کرے۔ بار بار قلم اٹھاتا اور رکھ دیتا
لیکن پھر عرفی نے ہمت بندھائی کہ ۔

دانم نہ رسد ذرّہ بخورشید و لیکن شوقِ طیراں می کشد ارباب ہمم را

اور میں آپ کی اس بزمِ مسعود میں شرکت کے لیے حاضر ہو گیا۔

حکمتِ خداوندی نے ابتداءِ آفرینش سے نبی و پیغمبر، بشیر و نذیر کا جو سلسلہ جاری کیا تھا
حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" کے اعلان
ساتھ ختم کر دیا گیا۔ یہ اعلان انسانی تاریخ کا اہم ترین اعلان ہے، جو انسان کو مذہبی احساس و شعور کی آخر
منزل پر پہنچانے کے بعد کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ وحیِ الٰہی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور آخر
پیغمبرؐ کی سیرت اور تعلیم انسانی ہدایت کے لیے ابد تک کے لیے قائم کر دی گئی، تاکہ بقولِ اقبال ۔

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے رفعت شان رفعنالك ذكرك دیکھے

ختم نبوت کے اس اعلان نے فطرتِ انسانی کی اصلاح و تربیت کے امکانات و تعینات کی ا
نئی اور وسیع دنیا کو نظروں کے سامنے پھیلا دیا، جس کے مضمرات کو سمجھے بغیر اس اعلان کی اہمیت کا
اندازہ ممکن نہیں ہے ۔

لانبی بعدی زاحسانِ خدا ست پردۂ ناموس دینِ مصطفیٰ است

(۱) اس اعلان کے ساتھ آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ اور حیات کو پوری طرح تار
کی روشنی میں دے دیا گیا۔ جب سے وحیِ الٰہی کا سلسلہ شروع ہوا تھا، تاریخ عالم نے ماہ و سال کی ہزار و
کروٹیں بدلی تھیں، لیکن کسی پیغمبر کی سیرت اور کارنامے اس تاریخ کی پوری روشنی میں جگمگاتے ن
نہیں آئے تھے، جس پیغمبرؐ کی زندگی کو سراجِ منیر اور ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ بنانا تھا، اس کے ۔
ضروری تھا کہ اس کی حیات کا ایک ایک گوشہ تاریخ کی روشنی میں محکم حقیقت کی طرح سامنے ر
اور فطرتِ انسانی کی رہنمائی کر سکے۔ سورہ المائدہ میں اعلان کیا گیا ہے:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۵: ۱۵)

"بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور ایک روشن کتاب"

سب مفسرین نے خواہ وہ عبداللہ ابن عباسؓ ہوں (تفسیر ابن عباس) یا علامہ محمود آلوسیؒ (روح المعانی)، امام سیوطیؒ ہوں (تفسیر جلالین)، یا امام فخر الدین رازیؒ (تفسیر کبیر)، سب نے تسلیم کیا ہے کہ یہاں نور سے مراد ذاتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا میں کسی پیغمبر کی زندگی اور تعلیم کی تفصیلات اور جزئیات اس صفحۂ عالم پر موجود نہیں ہے، جس طرح حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کی ترسٹھ سالہ حیاتِ طیبہ کا ایک ایک گوشہ انسانی نظروں کے سامنے ہے، خود آپ کا ارشاد تھا کہ جو کچھ مجھ سے سنو دوسروں تک پہنچاؤ "بلّغوا عنّی" شمائل ترمذی میں آپ کی روزمرہ عادات کو بیان کرنے کے لیے ۵۲ مستقل باب قائم کیے گئے ہیں اور معمولاتِ زندگی کی ایک ایک تفصیل بیان کردی گئی ہے۔

مسلمانوں نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی تلاش، ترتیب اور تحقیق کے لیے جو اصول ایجاد کیے، ان سے بہتر اصولِ استناد و ثبوت بنانے سے انسانی ذہن اب تک عاجز ہے اور فن تاریخ باوجود ان تمام ترقیوں کے جو اس نے گذشتہ صدی میں کی ہیں، اب تک نہیں پہنچ سکا۔ علماء و محدثین نے سیرتِ پاک کی ترتیب میں دو اصولوں کو اپنا رہبر بنایا تھا: اصولِ اسناد اور اسماء الرجال۔ اس تحقیق و تجسس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ واقعہ کی صداقت کے لیے ضروری ہے کہ واقعہ کی روایت کا سلسلہ شریکِ واقعہ تک پہنچ جائے اور وہ عینی شاہد کی حیثیت سے اس کو بیان کرے، پھر اس روایت میں جو اشخاص بھی شامل ہوں ان کی سیرت، کردار، حافظہ اور درجۂ اعتبار کی تحقیق کی جائے، چنانچہ اس نقطۂ نظر سے ہزارہا شخصوں کے حالات جمع کیے گئے۔ طبقات ابن سعد،، کتاب لعبداللہ بن علی بن الجارود، کتاب العقیلی فی الصحابہ، کتاب ابن حاکم الرازی وغیرہ میں ہزارہا ایسے بزرگوں کے حالات جمع کیے گئے ہیں جن سے حدیثیں نقل ہوئی ہیں۔ تاریخ عالم کوئی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جہاں راویوں کے خلاف میں اس نوعیت کی جستجو اس پیمانے پر کی گئی ہو۔ تاریخی فکر کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے، جو سیرتِ پاک کے سلسلہ میں مسلمانوں نے انجام دیا ہے۔ اس طرح حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور تعلیم کا ہر گوشہ تاریخ کے محکم ستونوں پر قائم ہو گیا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب اپنے بانی کی اتنی مکمل، اتنی مستند، اتنی محققانہ سیرت اور حالات پیش نہیں کرسکا۔ جس مذہب پر خالق کائنات نے اپنی وحی کا سلسلہ ختم کیا ہو اس کے بانی کے لیے تاریخ کی پوری روشنی لازمی و ناگریز تھی، تاکہ بنیادی حقیقتیں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوسکیں۔

(۲) پھر دوسری اہم ضرورت یہ تھی کہ جو آخری الہامی کتاب دی گئی ہو، اس کا ایک ایک حرف، ایک ایک نقط محکم ہو اور اس کی پاسبانی اللہ نے انسانی ذمہ داریوں سے نکال کر خود اپنے ہاتھ میں لے لی ہو، انسانی ذہن کے لیے اس میں ردّو بدل، ترمیم و تنسیخ یا اضافے کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی گئی ہو اور اس کی ہدایت پوری نسل انسانی کے لیے اور ہمیشہ کے لیے ہو۔ دنیا کی کوئی مذہبی کتاب اس طرح محکم Textual Foundations پر قائم نہیں ہے۔

(۳) پھر یہ ناگزیر تھا کہ "نور" اور "کتاب" دونوں کا رشتہ جڑا ہوا ہو، کتاب کی تعلیم اور صاحبِ کتاب کے اعمال میں مکمل مطابقت ہو، جس کتاب کی وہ تعلیم دیتا ہو خود اس کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔ مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پورے طور پر قرآنی زندگی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک بار سیرتِ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے پوچھا گیا۔ فرمایا: کیا تم نے قرآن پاک نہیں پڑھا، جو چیز وہاں حروف میں ہے، ان کی زندگی میں عمل میں تھی۔ حقیقتاً قرآن متن ہے اور سیرت اس کی تشریح، قرآن علم ہے اور سیرت اس کا عمل۔

(۴) پھر ضروری تھا کہ یہ ہدایت جو آخری نبیؐ کے ذریعہ پہنچائی گئی، زمان و مکان کی تمام بندشوں سے آزاد ہو کر پوری انسانیت کے لیے ہو۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّی رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۵۸ : ۷)

(اے پیغمبر!) کہو اے افراد! نسل انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔

حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ کتنے ہی پیغمبر مبعوث ہوئے اور اپنے ساتھ شریعتیں لائے، وہ سب ختم ہو گئیں، آپ یہ کیسے کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ہمیشہ کے لیے ہے۔ فرمایا: اس سے پہلے کی تمام شریعتوں کی بنیاد اس وقت کی ضروریات پر تھی، قرآن کی تعلیم فطرتِ انسانی کے نہ بدلنے والے تقاضوں پر قائم ہے اور یہ پوری انسانیت کے لیے ہے اور یہ ان نسلوں کی ضروریات کو بھی پورا کرتی ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئیں۔ انہوں نے ایک جملے میں اپنے عظیم المرتبت باپ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی عظیم الشان کتاب حجۃ البالغۃ کا خلاصہ پیش کر دیا، جس میں اسرارِ دین، جبلتِ لسانی اور ارتفاقات کی بحث نے علم و ادراک کی ایک نئی دنیا سجادی ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہبری کو انسانیت کی اصلاح و تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا ہے، جس پر گردشِ ماہ و سال کا اثر نہیں پڑ سکتا۔ بقولِ اقبال ع

خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

(۵) پھر اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ کسی دوسرے پیغمبر یا مذہبی رہنما کی زندگی کا اس طرح اتباع نہیں کیا گیا جس طرح حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کیا گیا ہے۔ سیرتِ پاک کا ہر پہلو مختلف قوموں، مختلف ملکوں، مختلف زبانیں بولنے والوں کے لیے ہمیشہ مکمل نمونہ **Ideal** رہا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ . (الاحزاب:۲۱)

بے شک رسول اللہ کی زندگی میں لوگوں کے لیے پیروی اور اتباع کا بہترین نمونہ ہے۔

چار پانچ سال ہوئے روم میں پوپ کے یہاں **Adels Of Holiness** ایک سیمینار ہوا تھا، خاکسار نے اسلام میں اس **Model** کی امتیازی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

" What Is unique about islam is that the ultimate model to be emulated es one. Translated in social terms it engenders a coherence a feeling of unity within the community. It also assigns a meaning to symbols and national barriers. The high Pedestal of the "Islamic model" i.e. the prophet is protected by the Quranic declaration that the prophet Muhammad was the iast of the prophets. It ensures that the model cannot be duplicated but at the same time in is reinforced by this desire of the community to follow the prophet down to the minutest detail. One who succeeds in closely following the prophet attains the status of a saint. It is however significantt that such a saint never becomes the model completely in himself but instead draws his legitimacy and appeal from the fact that he follows the prophet " (Islamochristiana, Rome 1985, p. 52)

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ جن کا نظامِ اصلاح و تربیت ایک زمانہ میں دہلی سے اورنگ آباد تک کام کرتا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کی روحانی حیثیت کا اندازہ لگانا ہو تو صرف دیکھو کہ وہ سنتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں کتنا راسخ ہے، جو شخص جتنا راسخ ہو گیا اتنا ہی اس کا روحانی درجہ بلند ہو گا۔ سعدی نے معرفتِ الٰہی کے سب راہ نوردہ کو صاف تنبیہ کی ہے ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید	که ہرگز بمنزل نخواہد رسید

تاریخ عالم میں کوئی ایسی دوسری مثال نہیں ملے گی جس میں پیغمبر کی سیرت اور عمل کا اتباع زندگی کے ہر ہر گوشہ میں اس طرح کیا گیا ہو، احکامِ شرعی کے اتباع کا معاملہ تو دوسرا تھا، ویسے بھی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر سنت اور ہر ہر راہِ عمل پر گامزن ہونے کی جہد و سعی اسلامی سوسائٹی کی خصوصیت رہی۔ اس اتباع نے عشق و محبت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ خود حکمِ خداوندی تھا کہ جو مجھ سے محبت کرنا چاہے وہ رسولؐ سے محبت کرے۔ اقبالؒ نے حضرت بایزید بسطامیؒ کا واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے خربوزہ کھانے سے محض اس بنا پر اجتناب کیا تھا کہ انہیں معوم نہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پھل کس طرح کھایا تھا۔ اسی کاملِ تقلید کا نام بقولِ اقبالؒ عشق ہے۔ خود اقبالؒ کے عشقِ رسول کی کیفیت یہ تھی کہ وفات سے چند روز قبل حضرت حق جل شانہ کو مخاطب کر کے یہ رباعی کہی تھی ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر	روزِ محشر عذرہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر	از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

حضرت مولانا الیاس دہلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ عشقِ رسولؐ کی اس ادا نے اقبالؒ کو یقیناً رحمتِ الٰہی کے جوار میں پہنچا دیا۔ عشقِ رسولؐ کے ساتھ ساتھ احترامِ رسولؐ کا جذبہ بھی ہمیشہ کار فرما رہا۔ جس وقت حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی، اس وقت تا دمِ زیست کبھی اپنا داہنا ہاتھ اپنے اعضائے ستر پر بھول کر بھی نہ لگایا۔

حضرت اویس قرنیؒ کے عشق اور عشق کے آشفتہ سری کا یہ واقعہ کہ جب سنا کہ جنگِ احد میں آپؐ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے، ایک ایک کر کے اپنے سارے دانت توڑ دیئے کہ شاید یہ دانت نہ ہو شاید کوئی اور دانت ٹوٹا ہو۔ عشق و متابعتِ رسولؐ کی یہی کیفیت تھی جس کے باعث حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ ان کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

حضرت امام مالکؒ کو جعفر بن سلیمان نے اتنا زدوکوب کیا کہ بے ہوش ہو گئے۔ خلیفہ منصور نے

ب جعفر سے امام مالکؒ کا قصاص مانگا تو امام صاحب نے یہ کہہ کر اسے بچالیا کہ خدا کی قسم میرے جسم سے
نڈ اٹھنے نہ پاتا تھا کہ میں اسے معاف کر دیتا تھا، اس بنا پر کہ اسے رسول اللہ ﷺ سے قرابت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کسی شخص سے بھی عشق و محبت کا وہ جذبہ قلوب انسانی میں پیدا
یں ہوا جو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیدا ہوا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بھی
زمین رسولؐ پر جوتے پہن کر نہیں چلے۔ امام مالکؒ چلتے ہوئے لڑکھڑاتے تھے کہ کہیں کسی جگہ قدم
پڑ جائے جہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدم رکھے گئے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ
یہ وسلم کی مدح میں نعت کا لٹریچر بھی دنیا کی مذہبی اور ادبی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ عشق و
بت اور عقیدت و احترام کے جذبات کا اظہار اس خلوص کے ساتھ اور متواتر اس دنیا کے کسی لٹریچر
ں نہیں ہوا۔ خود خالق کائنات نے نعت گوئی کی ابتدا اس طرح کی تھی:

"اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا"

"یقیناً اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے لوگو جو ایمان لائے ہو! درود بھیجو نبی
اور سلام بھیجو۔" (سورہ الاحزاب ۵۶: ۳۳)

بعض علمی اور ادبی شاہکار عشق رسولؐ میں سرشاری کی بہترین مثال ہے۔

امام بوصیری فالج میں مبتلا ہوئے، روح، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عرضِ حال کیا، حضورؐ نے
اب میں ایک ردا عطا فرمائی، بیماری دور ہو گئی۔ ان کا لکھا ہوا قصیدہ بردہ نعتیہ لٹریچر میں اپنا جواب
یں رکھتا۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب نے اپنی کتاب "عربی میں نعتیہ کلام" میں بعض عربی
نتوں کا نہایت بصیرت افروز تعارف کرایا ہے۔ فارسی زبان میں بھی نعتوں کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔
ناب مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ فارسی زبان کا قدم اس وادی ایمن
رہ نوردی میں سب سے آگے رہا ہے۔ اردو زبان میں بھی نعتیہ لٹریچر بہت جاندار ہے۔ ایک
تشرق نے انڈونیشیا سے ترکی تک نعتی لٹریچر کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض دلچسپ
ئج اخذ کیے ہیں۔ اگر انسانی ذہن کبھی محبت کے ناپنے کے پیمانے ایجاد کرنے میں کامیاب ہوا تو
رازہ ہو گا کہ عشق و محبت کی کیسی دنیا ان نعتیہ اشعار میں سمٹ آئی ہے۔ دنیا کے کسی مذہبی رہنما سے
قیدت اور محبت کا اظہار اس طرح نہیں کیا گیا، جیسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

(ے) پھر یہ حقیقت ہے کے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کا مرکزی نقط صرف ذاتِ رسولِ کریم
لی اللہ علیہ وسلم ہے، جتنا اس سے قرب ہو گا اتنی ہی اجتماعی زندگی میں توانائی اور انفرادی زندگی کی

سربلندی حاصل ہو گی۔ اقبالؒ نے جوابِ شکوہ اللہ کے اس ارشاد پر ختم کیا ہے۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

جب اس چشمۂ نور سے اکتسابِ فیض میں کمی واقع ہو گی، بہارِ زندگی خزاں دیدہ ہو جائے گی۔ ملتِ اسلامیہ کے لیے فلاح و نجات کی راہ صرف یہ ہے۔

بہ مصطفٰی بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
گر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبالؒ نے اپنے ایک لیکچر میں کہا تھا:

"ایک سبق جو میں نے تاریخِ اسلام سے سیکھا ہے یہ ہے کہ صرف اسلام تھا، جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔"

اور اس حیاتِ ملّی کا راز سیرت و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل اتباع تھا جب ممالک اسلامیہ پر زوال و انحطاط کی گھٹائیں چھائیں تو صورتِ حال یہ تھی۔

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفٰی نایاب و ارزاں بولہب

ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کا یہ راز بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جب کبھی یہاں ملی زندگی پر افسردگی کی کیفیت طاری ہوئی ہے، دیارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق نے زندگی میں نئی توانائی بخش دی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، خواجہ محمد معصومؒ، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ، وغیرہم نے مدینہ منورہ ہی میں اپنے تھکے ہوئے احساس و شعور میں نئی جان اور توانائی پیدا کی ہے اور وہاں سے واپس آکر اپنی زندگیاں احیاءِ ملت کے لیے جدوجہد میں بسر کر دی ہیں۔ اقبالؒ نے خوابگاہِ مصطفٰی کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفٰی
دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا

خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں

تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی

نام لیوا جس میں شاہنشاہِ عالم کے ہوئے
جانشینِ قیصر کے وارثِ مسندِ جم کے ہوئے

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

حقیقت یہ ہے کہ ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اور اتباعِ سنتِ رسولؐ ہی میں

مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کا راز پوشیدہ ہے: اسی لیے ابلیس نے اپنے سیاسی فرزندوں کو حکم دیا تھا ؎

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا   روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

تاریخ عالم میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور مقام کی اس مکمل انفرادیت اور مذاہبِ عالم میں ان کی غیر معمولی عظمت و شان کے پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے چند ان اثرات کا ذکر بھی ضروری ہے جن سے اس کرۂ ارضی پر تقدیر آدم بدلی ہے اور انسان نے احترامِ انسانیت کا سبق سیکھا ہے۔

(۱) رحمتہ للعالمین

قرآن پاک میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :

" مَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ." (۲۱:۱۰۷)

"ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر اس لیے کہ تمام عالموں کے لیے رحمت کا ظہور ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا دائرہ ایک رکھا ہے، وہ خود "ربّ العالمین" ہے تو اس کا آخری رسولؐ "رحمتہ للعالمین"۔ یہ سب سے بڑا حسن و امتیاز ہے جو اس نے اپنے آخری رسولؐ کو عطا فرمایا ہے اور اس کا رتبہ جس طرح بلند کیا ہے، اس کا ادراک و احاطہ انسانی ذہن مشکل سے کر سکتا ہے۔ بقولِ غالب ؎

غالب ثنائے خواجہ بیزداں گذاشتیم   کاں ذات پاک مرتبہ داں محمد است

سورۂ مائدہ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "نور" سے تعبیر کیا ہے اور سورۂ نور میں خود اپنے متعلق فرمایا ہے:

" اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ "

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔"

خالق کائنات نے اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اظہار طرح طرح سے کیا ہے۔ ذرا فکر کا دائرہ وسیع کیجیے اور بعض پہلوؤں پر غور فرمایئے!

(۱) شیخ عبدالحق محدثِ دہلویؒ مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے پورے ایمان کو آپؐ کے ذکر کے ساتھ اپنے ذکر کی معیت میں لازم کیا ہے یعنی لاالہٰ الااللہ محمد رسول اللہ"

(۲) اللہ تعالیٰ نے آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

" مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ "

"جس نے رسول کی پیروی کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"

(۳) اللہ تعالیٰ نے آپ کی متابعت کو اپنی محبت کا مستلزم قرار دیا اور فرمایا:

" فَاتَّبِعُوْنِی یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ "

"میرا اتباع کرو اللہ تمہیں محبوب بنالے گا۔"

(۴) نماز میں:

اشہد اَن لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمد اًعبدہ ورسولہ کہلانے کے بقدر درود کا التزام کیا گیا ہے، پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت واحترام پر قرآن پاک میں جس طرح توجہ دلائی گئی ہے، وہ قابلِ غور ہے۔

(۱) حکم ہوتا ہے:

" یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ "

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو!"

(۲) دوسرا حکم ہوتا ہے:

" یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ "

"اے ایمان والو! اپنی آواز کو نبی کی آواز سے اونچا نہ کرو!"

(۳) پھر حکم ہوتا ہے:

" لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا "

"رسول کے پکارنے کو اپنے درمیان ایک دوسرے کو پکارنے کے مانند نہ بناؤ!"

پھر حکم ہوتا ہے:

" وَ تُعَزِّرُوْہُ (ای تبجلوہ و تبالغوہ فی تعظیمہ ، و تنصرونہ) "

"ان کی عزت کرو، ان کی تعظیم میں مبالغہ کرو اور ان کی نصرت واعانت کرو۔"

مبادا کوئی ذہن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امی ہونے سے اُن کو بے علم سمجھنے لگے۔

اعلان ہوتا ہے:

" وَ عَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَ کَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْماً "

"اور جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے وہ سب اللہ نے سکھادیا اور اللہ کا فضل آپ پر عظیم ہے۔"

اللہ تعالیٰ مکہ کی قسم کھاتا ہے تو محبت کے کس انداز میں فرماتا ہے "اس لیے کہ تراوجود این

زمیں میں رہا اور بسا"۔

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است　　　اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے لیے عبدہ کا لفظ جگہ جگہ استعمال کیا ہے، تاکہ محبوبیت، رسالت اور رحمت کے سارے اوصاف عبودیت کے دائرے میں رہیں۔

عربی میں رحمت، عواطف کی ایسی رقت کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسری ہستی کے لیے احسان و شفقت کا ارادہ جوش میں آئے۔ پس رحمت میں بقولِ مولانا آزاد، محبت، شفقت، فضل، احسان، سب داخل ہے اور مجرد محبت، لطف اور فضل سے زیادہ وسیع اور حاوی ہے۔

پھر عالمین کا لفظ بھی قابل غور ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس صرف انسانوں پر ہی نہیں بلکہ ہر جاندار پر رحمت ہے۔ عالمین کے مفہوم کے سلسلہ میں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں اور پرندوں کو بھی انسان کی طرح ایک امت قرار دیتا ہے۔ سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَ مَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ."

"اور نہیں ہے کوئی چلنے والا زمین میں اور نہ کوئی پرندہ کہ اڑے اپنے دونوں بازوؤں سے، مگر یہ امتیں ہیں مانند تمہاری۔"

قرآن کے اس فرمان نے Ecological Persfecives کو نئی معنویت بخشی ہے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و شفقت کے سایہ میں صرف اقوامِ عالم کو ہی نہیں دیا گیا، بلکہ چرندوں، پرندوں غرض ہر ذی روح کو اس کے سایہ میں دیا گیا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مدارج النبوت میں لکھتے ہیں:

> "بعثت کرد خدائے تعالیٰ او را بسوئے کافہ ناس و مقصور نہ گردانید رسالت او را بر ناس بلکہ عام گردانید جن و انس را بلکہ بر جن و انس مقصور نہ گردانید تا آنکہ عام شد تمامہ عالمین را، پس ہر کرا اللہ تعالیٰ پروردگار اوست محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول اوست و چناں کہ ربوبیت حق شامل تمام اہل عالم است خلق محمدی نیز شامل آنست۔"
>
> "اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام بنی نوع انسان کی طرف مبعوث فرمایا اور آپ کی رسالت کو محض انسان پر محدود و مقصور نہ گردانا، بلکہ سارے جہاں کی مخلوق پر رسالت عام فرمائی، جس طرح حق تعالیٰ کی ربوبیت تمام اہل عالم کو شامل ہے، خلق محمدی بھی

ان سب کو شامل ہے۔" (مدارج النبوۃ ۱/ ۴۱- ۴۲)

امام اکبر شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے "رحمتہ للعالمین" کے تصور پر بڑی مؤثر اور عالمانہ بحث کی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی میں اس تصور کا جو اثر تھا، اس کی ایک مثال عرض کر دینا بے محل نہ ہو۔ داراشکوہ نے شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ کو لکھا کہ کیا حکومت ہندو مسلمان میں فرق کر سکتی ہے؟ جواب دیا: نہیں، اس لیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "رحمتہ للعالمین" بنا کر بھیجا گیا ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چیونٹیوں تک کو اپنی رحمت کے سایہ سے محروم نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذارسانی ایک شرعی جرم ہے، اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔ (سیرت النبی ۶/ ۳۴۶) کچھ لوگوں نے چیونٹیوں کے ایک گچھے کو جلا دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی کہ آگ کی سزا صرف خدا ہی کو سزاوار ہے، ایک چڑیا کو کسی نے پکڑ لیا، ان کو چھڑا دیا کہ اس کی ماں کا دل اس کی وجہ سے بے چین تھا۔ جس پیغمبرؐ کی محبت و شفقت چیونٹیوں اور چڑیوں تک کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہو، اس کی عظمتِ شان پر اگر خالق عالم گواہی دے تو تعجب کی بات نہیں۔ رحمت و شفقت کے اس پیکرِ عظیم کی یہ صدا ہمیشہ گونجتی رہے گی۔

"تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔" (مستدرک حاکم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جنگِ اُحد میں اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے طائف کا واقعہ کا ذکر فرمایا کہ:

"میرے پاس پہاڑوں کا فرشتہ آیا اور بولا: ارشاد ہو تو پہلو کے دونوں پہاڑ ان لوگوں پر الٹادوں اور وہ پس جائیں۔ میں نے کہا: نہیں، نہیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ہی میں سے ایسے لوگ پیدا کر دے جو صرف ایک خدا کی عبادت کریں۔"

کفار کی سختیوں اور مظالم سے تنگ آکر صحابہؓ نے ایک بار بد دعا کی درخواست کی فرمایا:

"میں لعنت کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہوں، بلکہ حق کی دعوت اور جہان کے لیے رحمت ہو کر مبعوث ہوا ہوں۔"

فرمایا کرتے تھے کہ مجھے میرے رب نے وصیت کی ہے کہ جو مجھ پر ظلم کرے اس کو میں معاف کر دوں، جو میرا مقاطعہ کرے میں اس کے ساتھ سلوک اور صلہ رحمی کروں، جو مجھے محروم رکھے اس کو میں عطا کروں۔

یہ شانِ رحمت ہے، جس نے اس طرح دشمنوں پر رحمت و شفقت فرمائی۔

(۲) بعثت کا مقصد

قرآن پاک میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

"وَ یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَ الْحِکْمَةَ"

"اور پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور دانائی کی باتیں۔"

موطا امام مالک میں یہ حدیث درج ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں، بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔

اس دنیا میں جہاں انسان بڑھتے ہیں اور انسانیت گھٹتی جاتی ہے، اولادِ آدم کو انسان بنانے کا کام سب سے اہم ہے، لیکن سب سے مشکل کام ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ حسن اخلاق کی تکمیل فرمائیں، انسان کو انسانیت کا احترام سکھائیں، تاکہ اس دنیا میں فوز و کامرانی کے الفاظ شرمندۂ معنی ہو سکیں۔ اس کوشش کی سب سے پہلی کڑی یہ تھی کہ سارے انسانوں میں بہ حیثیتِ انسان سارے امتیازات کو مٹا دیا جائے۔ کوئی نظام اس وقت تک بروئے کار نہیں آسکتا جب تک اللہ کی ساری مخلوق کو یکساں نہ سمجھا جائے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا:

"اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عَیَالِهٖ۔"

"خدا کی سب مخلوق اس کا کنبہ ہے اور وہ خدا کا سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ سب سے زیادہ بھلائی کرتا ہے۔"

سنن ابوداؤد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے جو دعا اور مناجات کرتے تھے، اس ایک جملہ یہ بھی تھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں، أنا شهيد أنّ العباد كلّهم إخوة۔

بخاری میں آپؐ نے فرمایا:

"لَا تَبَاغَضُوْا وَ لَا تَدَابَرُوْا وَ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا۔"

ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، نہ ایک دوسرے سے حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے خدا کے بندہ! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

وحدتِ نسل انسانی کے بعد تکمیل اخلاق کا دوسرا اہم ستون وہ تعلیم تھی جو بار بار مجالس نبوی میں دی گئی اور جس کو ایمان کی شناخت ہی نہیں، بلکہ اس کا کمال قرار دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

"تم تمام انسانوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے۔"

(سیرت النبی ٦/ ٣٤)

اگر عملی حیثیت سے ان دو اصولوں پر غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اخلاقِ انسانی کی تکمیل کا سارا دار و مدار ان ہی پر ہے اور جس معاشرہ میں یہ اصول بروئے کار آجائیں وہاں قلوب خود بخود ایک رشتۂ الفت میں پڑ جائیں گے۔

اپنے آخری پیغمبر کی بعثت کی بشارت اللہ جل شانہ نے توریت، انجیل اور دیگر صحفِ انبیا میں دے دی ہے۔ مولانا عنایت رسول چریاکوٹی نے "بشریٰ" میں جس محققانہ انداز میں ان بشارتوں پر بحث کی ہے وہ لائق مطالعہ ہے۔ سب میں تکمیل اخلاق کا پہلو سب سے نمایاں ہے۔

(٣) انسان کی آزادی

سورۂ اعراف میں اعلان کیا گیا ہے:

" وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ " (١٥٧)

یعنی پیغمبر اسلامؑ کے ظہور کا یہ مقصد ہے کہ گرفتاریوں اور بندشوں سے انسان کو نجات دلادے اور غلامی کے جو طوق انہوں نے اپنی گردنوں میں پہن رکھے ہیں ان کے بوجھ سے رہائی دے۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح غلامی کے طوق انسان کی گردن سے اتارے ہیں اور تمام بہیمانہ بندشوں سے نجات دلائی ہے، اس کی دوسری مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔

جولائی ١٧٧٦ء میں امریکہ نے اپنے اعلانِ آزادی کی بنیاد انسانی مساوات پر رکھی تھی، پھر ١٧٨٩ء میں انقلابِ فرانس برپا ہوا اور Doclaration Of The Rights Of Man منشور حقوقِ انسانی کا اعلان کیا گیا۔ ان اعلانات سے تقریباً ساڑھے گیارہ سو سال قبل حضور سرورِ کائنات ﷺ نے انسانی حقوق کا اعلان کیا تھا اور انسانیت کے حقوق کا احساس دلایا تھا۔ ١٩٤٨ء میں **Uneted Nations** نے **Universal Declaration Of The Human Rights** کی تیس دفعات کا اعلان کیا۔ اس تقریباً ١٦٢/ سال کی مدت میں انسانی کاوش پورے طور پر انسانی آزادی کی ضمانت نہیں کر سکی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ سارے اعلانات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۃ الوداع کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ آخری خطبہ انسانیت کا سب سے بڑا منشور آزادی ہے۔ چودہ سال گذر چکے، لیکن جو صدائے حق میدانِ عرفات سے بلند ہوئی تھی اس سے بڑھ کر آج تک اولادِ آدم کی بہتری کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھائی گئی۔ اس

نے تین معاصر تہذیبوں - رومی، ساسانی اور ہندوستانی - کی پیدا کی ہوئی ایک ایک سماجی بیماری کی نشاندہی کی اور انسان کو آزادی کا پیغام دیا، غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر احترام انسانیت کا سبق پڑھایا۔

اس زمانہ کی دنیا سماجی طبقات پر قائم تھی۔ Justinian جس نے روم کے قانون کی تدوین کی تھی اور دنیا کو چیلنج کیا تھا کہ اس سے بہتر قانون بنا کر دکھائے، سارے سماج کو پانچ طبقوں میں تقسیم کیا تھا، جرائم کی سزا کا انحصار سماجی طبقہ سے تعلق پر تھا Honestiores کو جو اعلیٰ ترین طبقہ تھا، بغاوت کے سوا کسی جرم پر سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی، لیکن سب سے نیچے طبقے کو جو Servi کہلاتا تھا، معمولی معمولی جرائم کی سزا میں آگ میں ڈال دیا جاتا تھا، ایران میں آذروان، آرتشتیان، دبیران، استریوشان، چار طبقے تھے، کوئی شخص ایک طبقہ سے دوسرے طبقے میں منتقل نہیں ہو سکتا، نیچی ذات کے لوگ نہ سرکاری دفتر میں ملازم ہو سکتے تھے، نہ جائداد خرید سکتے تھے، ہندوستان میں برہمن، چھتری، ویش، شودر، چار ذاتیں تھیں، ان چار ذاتوں کے بعد عوام کا شمار تھا، جو Chandala Rudhatu Hadi Doma وغیرہ ناموں سے پکارے جاتے تھے، ان نیچی ذات کے لوگوں کو شہر سے باہر رہنا پڑتا تھا، مقدس کتابوں کا ایک حرف کان میں پڑ جاتا تو سیسہ پگھلا کر کان میں ڈال دیا جاتا تھا، مذہبی تعلیم مخصوص طبقہ کی اجارہ داری تھی، ان تین تہذیبوں میں غلاموں کی حیثیت جانوروں سے بدتر تھی، اگر کوئی غلام اپنے آقا کے خلاف عدالت میں شکایت لے جاتا تو Justinian کے قانون کے مطابق اس کو سزائے موت دی جاتی تھی، ایک شخص کے ارتکابِ جرم پر پورے خاندان کو سزا دی جاتی تھی۔

یہ تھا اس زمانہ کی متمدن دنیا کا ماحول جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ عرفات میں کھڑے ہو کر اس جابرانہ نظام کا ایک ایک ستون گرایا اور انسانیت کو نئی زندگی کا پیغام دیا۔ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا:

"جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔"

اس کے بعد انسانیت کو تمام مصنوعی امتیازات سے آزاد کرتے ہوئے فرمایا:

"لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے، ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب ہے۔"

اس اعلان نے حسب و نسب، ذات، ہر قسم کے امتیازات کو باطل کر دیا اور انسان کو بہ حیثیتِ انسان ایک سطح پر لا کھڑا کیا، فضیلت صرف ایک بات میں رکھی ہے اور وہ ہے تقویٰ، اللہ سے ڈرنا اور

نیک کام کرنا۔ سماج میں اس سے بڑا انقلابی تصور کیا ہو سکتا ہے کہ حسب نسب، دولت، اقتدار، جاہ و حشمت سب کو نظر انداز کر کے، اخلاق کو معیارِ فضیلت قرار دیا جائے۔

بخاری میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے:

"خِیَارُکُمْ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقاً۔"

"تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔"

نسل انسانی کی وحدت کا اعلان اس طرح فرمایا:

"اللہ نے آباء واجداد پر فخر کو مٹا دیا، تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔"

اس ایک جملہ میں اولادِ آدم کو نہ صرف ایک مقام پر کھڑا کیا گیا ہے، بلکہ ان تمام خاندانوں کی امتیازی حیثیت کو جو چاند سورج سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے اور ماورا ہ قوتوں کے مظاہر بنے ہوئے تھے، ایک انسانی سطح پر لا کھڑا کیا۔ اس دنیا کی سب سے بڑی لعنت غلامی تھی۔ اعلان فرمایا:

"تمہارے غلام، تمہارے بھائی ہیں جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔"

پھر ہدایت فرمائی:

"اگر کوئی حبشی بنی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔"

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان بھی معصوم انسانوں کے لیے ایک بشارت تھی:

"ہاں، باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ۔"

سنن ابو داؤد میں ہے کہ آپؐ نے اعضاء کے کاٹنے سے منع فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی غزوہ میں ایک مقتول عورت دیکھی۔ اس پر آپؐ نے بچوں اور عورتوں کو قتل سے منع فرما دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے "الحرب والاسلام" میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات بہ سلسلہ جنگ کا بڑا بصیرت افروز جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ صلح و امن کا معاملہ تو دوسرا ہے، جنگ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عظیم الشان انسانی اصولوں پر عمل کیا تھا۔

سولن نے ایک جگہ لکھا ہے: کہ قانون تارِ عنکبوت ہے جو اپنوں سے کمزوروں کو دبا لیتا ہے، مگر اپنے قویٰ سے ٹوٹ جاتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طاقتور اور کمزور سب کے لیے یکساں قانون وضع کیا اور ثابت کر دیا کہ عدل و انصاف کی بنیاد صرف حق و صداقت پر قائم ہونی چاہیے۔

اللہ کے آخری نبیؐ نے اپنے آخری خطبہ میں انسان کو تمام بندشوں سے آزاد کر دیا تھا اور

آئینۂ ایام میں اس کو نئی تصویر اس اعلان کے ساتھ دکھائی تھی کہ ع

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ

اور اس میں اپنی تقریر کا نوشتہ پڑھنے کی دعوت دی تھی۔

آج دنیا میں ہر طرف انسانی حقوق کے تحفظ کا چرچا ہے، لیکن بقولِ اقبال کون نہیں جانتا کہ یہ سب باتیں نقاب کی مانند ہیں، جن کے پیچھے دنیا کے گوشے گوشے میں قدرِ حریت برباد ہو رہی ہے ہے اور شرفِ انسانیت کو مجروح کیا جا رہا ہے، تہذیبِ حاضر نے انسان اور انسانیت پر ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے ہیں اور یہ طریقے ایسے ہولناک ہیں جن کی مثال تاریخ عالم کا تاریک سے تاریک صفحہ بھی پیش نہیں کر سکتا۔

جو قومیں حقوقِ انسانی کی پاسبانی کے سب سے زیادہ بلند بانگ دعوے کر رہی ہیں، وہی انسان کی تباہی کے لیے نئے نئے طریقوں کی ایجاد میں سب سے پیش پیش ہیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ نہ کسی سیاسی مصلحت کا نتیجہ تھا، نہ کسی وقتی جذبے کی پیداوار، یہ اللہ کے آخری رسول کا انسان کے نام آخری پیغام آیا ہے، جس میں بتایا گیا تھا کہ انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔

وحیِ الٰہی کا جو سلسلہ غارِ حرا کی تنہائیوں میں شروع ہوا تھا، میدانِ عرفات کے بھرے مجمع میں اس کی تکمیل اس اعلان کے ساتھ کر دی گئی کہ:

"جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو سنا دیں جو موجود نہیں۔"

(۴) حیاتِ انسانی کا مقصد

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کی صورت میں پیش فرمایا، جس میں عبادات، اخلاق اور معاملات تینوں کو ایک مرکزی تصور کے تابع کر دیا تھا اور وہ تھا خدا کے لیے جینے کا تصور۔ یہ فکر و نظر کا وہ انقلاب ہے جو انسانی پیکر میں ایک نئی زندگی، ایک نئی قوت، ایک نیا یقین، ایک نیا مقصد اور ایک نیا جذبہ پیدا کر دیتا ہے، انسان کا ہر کام عبادت بن جاتا ہے، جب انسانی قلب سے یہ آواز آنے لگے:

"اِنَّ صَلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ ربّ العالمین." (انعام: ٢٠)

"بیشک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اسی عالم کے پروردگار کے لیے ہے۔"

تو وہ تخلیق کائنات کا مقصد پورا کرتا ہے۔ یہ کیفیت تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔ تقویٰ
لغوی معنی بچنے اور پرہیز کرنے کے ہیں، لیکن بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ وحی کی اصطلاح میں
ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شد
رغبت اور اس کی مخالفت کی شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جاننے پر ۔
حضرت شیخ علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب کی ابتدا ایک قصہ سے کی ہے، جس سے ثابت کیا ہے کہ ج
اللہ تعالیٰ کو حقیقت میں حاضر و ناظر سمجھنے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو معصیت کے سوتے خود
انسانی زندگی میں خشک ہو جاتے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقویٰ کی اسی کیفیت کو
کرنے کی جہد و سعی فرمائی تھی اور اسی میں انسان کو فوز و کامرانی کی بشارت دی تھی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہروں کو ایک حد سے زیادہ بڑھنے سے روکا، اس لیے
ان میں احساسِ تقویٰ کم ہو جاتا ہے اور اخلاقی قدروں کا احترام کمزور ہونے لگتا ہے۔ اس سلسلہ م
اقبالؒ کی مسولینی سے ملاقات کا واقعہ یاد آ گیا۔ مسولینی نے اقبالؒ سے کہا کہ کوئی ایسی نصیحت کریں ج
پر عمل کرنا فائدہ مند ہو! اقبال نے کہا: میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی شہ
ایک حد سے زیادہ نہ بڑھنے دو، دوسرے شہر آباد کرلو، جب شہر بڑھتا ہے تو **Moral Fibre** کمز
پڑ جاتا ہے۔ مسولینی نے یہ سنا تو بے اختیار کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: بڑی سچی بات ہے۔

حقیقتاً تقویٰ اسلام کے اخلاقی نظام کا مرکزی ستون ہے، جس پر حضور ﷺ نے بار بار مختلف
طریقوں سے زور دیا ہے۔ احساسِ تقویٰ کے بغیر کوئی معاشرہ فلاح کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔

(۵) انسانیت کا ارتقاء

واقعۂ معراج میں انسانیت کے لیے ایک پیغام ہے۔ بقولِ اقبالؒ ۔

سبق ملا یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے — کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بعض بنیادی حقائق پر نظر ہونی ضروری ہے۔ سائنس ۔
جسم انسانی کے ارتقاء کی منزلوں کا پتہ لگانے میں بڑی کاوش کی ہے اور تدریجی تغیر کے عالمگیر قانو
کی نوعیت کا پتہ لگایا ہے، لیکن ان کی یہ ساری تحقیق اور جستجو جسم تک محدود ہے، ان کا کہنا کہ جو
جمادات، نباتات، حیوانات کی کروٹیں بدلتا ہوا انسانیت کے مرتبہ کو پہنچا اور یہاں پہنچ کر حیوانیت
پچھلی کڑیوں سے جدا ہو گیا۔ یہ بتانے سے وہ یکسر عاجز ہے کہ ارتقاء کی یہ زنجیر ہیکل انسانی کی کڑی تک
پہنچ کر کہاں چلی جاتی ہے اور اس کے بعد ارتقاء کے منازل باقی رہتے ہیں یا نہیں --- اسلام نے ا

اس کے پیغمبرؐ نے اس کا جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ بلاشبہ انسانیت کے مرتبہ پر پہنچنے کے بعد ارتقاءِ جسمی تو ختم ہو جاتا ہے، لیکن اس کے بعد ارتقاءِ روحانی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور فکر و ادراک کی بے پناہ قوت پیکرِ انسانی میں اگلی کڑی تک ابھرنے کی جستجو بیدار کر دیتی ہے، یہ اگلی کڑی روحانی ہے، جسمانی نہیں، اس میں ایک تخلیقی اصول Creative Principle کارفرما ہے، جس کے سہارے انسان زمان و مکان کی تسخیر کرتا ہے اور اس منشہ الٰہی کو پورا کرتا ہوا کہ

" وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعاً مِّنْهُ " (الجاثیۃ ۱۲ :۴۵)

"اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اس کو اپنی طرف سے تمہارا مسخر کر دیا۔

عالمِ ملکوت کی طرف بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس منزل کے طلب گاروں سے وعدہ فرماتا ہے۔"

" وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا " (العنکبوت ۲۹ :۲۹)

"اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں انکو اپنے رستے ضرور دیکھا دیں گے۔"

اس کی وضاحت صحیح بخاری کی ایک حدیثِ قدسی میں اس طرح کی گئی ہے :

"میرا جو بندہ نوافل کے ذریعہ میری قربت حاصل کرتا ہے تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں، جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں، جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں، جن سے وہ چلتا ہے۔"

انسان کے ارتقاعِ روحانی کی یہ بشارت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دے کر نئے امکانات کی ایک دنیا کھول دی ہے، جس کا احساس اقبالؒ کے مذہبی وجدان نے اس طرح کیا تھا ؂

عروجِ آدم خاکی کے منتظر ہے تمام — یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

اللہ کے آخری نبیؐ نے انسان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کیا، اس کو احترامِ انسانیت کا سبق پڑھایا اور ارتقاعِ روحانی کی راہ دکھائی۔

اللہ نے اپنے آخری نبی کو روشن چراغ قرار دیا ہے۔

" يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِداً وَّ مُبَشِّراً وَّ نَذِيْراً O وَ دَاعِياً اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجاً مُّنِيْراً O " (الاحزاب : ۳۳ :۴۶-۴۵)

"اے نبی بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے بطورِ گواہ اور بشارت دینے والے اور ڈرانے والے کے اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے کے اور بطورِ ایک روشن چراغ کے۔"

" لَقَدْ مَنَّ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ

يُزَكِّيهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ O " (آل عمران ۳ : ۱۶۴)

"حقیقت میں اللہ نے بڑا احسان مسلمانوں پر کیا جب کہ انہی میں سے ایک پیغمبر ان میں بھیجا، جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک صاف کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔

سراپا ہدایت :

" وَ اِنَّهٗ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ " (النمل ۲۷ : ۷۷)

"اور بے شک وہ ایمان والوں کے حق میں ہدایت ورحمت ہے۔"

حامل صدق :

" وَ الَّذِيْ جَاءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ اُولٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ O " (الزمر ۳۹ : ۳۳)

"اور جو لوگ سچی بات لے کر آئے اور (خود بھی) اس کو سچ جانا تو یہی لوگ تو پرہیز گار ہیں۔

عبدِ کامل :

" سُبْحٰنَ الَّذِی اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِى بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا . "

"پاک ذات ہے وہ جو اپنے بندہ کو راتی رات مسجد حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گیا، جس کے ارد گرد کو ہم نے بابرکت بنا رکھا ہے، تاکہ ان کو ہم بعض اپنے عجائب (قدرت) دکھائیں گے۔ (٦)

صاحبِ خلق عظیم :

" وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ "

"اور بیشک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں۔" (تعلیم ۶۸ : ۴)

تاریکیوں سے نکالنے والا :

" الٓمٓر كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ O بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ " (ابراہیم ۱۴ : ۴)

"الف لام را (یہ) کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر اتارا ہے، تاکہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لائیں۔ ان کے پروردگار کے حکم سے، یعنی (خدائے) غالب وستودہ صفات کی راہ کی طرف۔"

مرکزی حق :

" یٰاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَاءَ کُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّکُمْ فَاٰمِنُوْا خَیْراً لَّکُمْ " (النساء ۴ :
۱۷۰)

" اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس (یہ) رسول تمہارے پروردگار کے پاس آتے ہیں، سچی بات لے کر، پس ایمان لاؤ یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ "

اور نورِ حق :

" قَدْ جَائَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیْنٌ " (المائدہ ۵ : ۱۵)

بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آچکی ہے۔ "

بتایا ہے حقیقت یہ ہے کہ خالق کائنات کا تخلیقی شاہکار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے، جس پر اس کو خود ناز تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے ؎

پیکر آرائے ازل صورت زیبائے ترا نقش می بست و ہم از ذوقِ تماشا می کرد

☆☆☆

صاحبِ ”خطباتِ حیدر آباد“

مولانا عبداللہ عباس ندوی

ممتاز عالمِ دین، مایہ ناز انشاء پرداز

ڈاکٹر محسن عثمانی (دہلی یونیورسٹی دہلی)

مولانا عبد اللہ عباس ندوی (پیدائش ۱۳۴۴ھ) جن کے خطبات سیرت کی نکہت سے سرزمین حیدر آباد مشک آباد ہونے والی ہے، ایک درجن سے زیادہ علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مولانا کی عالمانہ تحریریں یوں تو مختلف موضوعات پر ہیں، لیکن ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ان کی کتابوں کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ مولانا کے ذوق و شوق کی جولان گاہ ہے۔ ہر تھوڑے دنوں کے بعد مولانا کے قلم سے اس مبارک موضوع پر کوئی کتاب شائع ہو جاتی ہے یا کوئی تحریر منظر عام پر آجاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع سے ان کا والہانہ لگاؤ ہے اور یہ جذبۂ محبت ان کے دل میں موجزن اور اس طائرِ محبت کا ان کے سینہ میں مستقل نشیمن ہے۔

مولانا عبد اللہ عباس ندوی کی ایک قابل ذکر اور ممتاز کتاب ”عربی میں نعتیہ شاعری“ ہے، جو اس موضوع پر اردو میں پہلی محققانہ اور جامع تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۵ء میں مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب عشق رسول کی خوشبو سے معطر تھی اور اس نذرانۂ عقیدت کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ اس کے بعد مولانا نے اپنے اسی محبوب موضوع پر دوسرا کام شروع کیا۔ مولانا کی یہ علمی کاوش ”ردائے رحمت“ کے نام سے منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ”قصیدہ بانت سعاد“ اور ”قصیدہ بردہ“ کی اردو میں شرح اور ترجمانی ہے۔ قصیدہ بردہ وہ قصیدہ ہے جو حضرت کعب بن زہیرؓ نے خود مسجد نبوی کے اندر صحابۂ کرامؓ کی موجودگی میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش کیا تھا اور جس کے ایک شعر پر ان کو ردائے مبارک مرحمت ہوئی اور جس کو صحابۂ کرام اور تابعین اور تبع تابعین پڑھتے اور سنتے رہے۔ مولانا عبد اللہ عباس ندوی نے ادبی انداز میں قصیدہ کی شرح لکھی اور بلاغت کے باریک نکتوں کو واضح کیا۔ عربی ادب اور بلاغت مولانا کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس موضوع پر مولانا کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں کتابیں موجود ہیں؛ اس لیے عربی نعتیہ کلام کی شرح اور ترجمانی کے لیے مولانا سے بہتر کوئی دوسری شخصیت نہیں ہو سکتی تھی۔ نعتِ رسول ہو یا سیرتِ

سول صلی اللہ علیہ وسلم اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے صرف علم اور صرف عربی ادب کی
بلیت کافی نہیں ہے، اس کے لیے اس عشق کی حرارت کی ضرورت ہے جس کے بغیر شرع و دیں
ال کی زبان میں بتکدۂ تصورات ہے اور یہی وہ آگ ہے جس نے اقبالؒ سے یہ الہامی شعر کہلوایا۔

بہ مصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اس آتش کدۂ عشق کی چنگاری جسے نصیب ہو جاتی ہے، اس کا کیا حال ہوتا ہے، اس کی ایک
ال مولانا عبد اللہ عباس ندوی کے یہاں دیکھیے: رابطۂ ادبِ اسلامی کی طرف سے اکتوبر ۱۹۹۰ء میں
ں شہر حیدر آباد میں سیمینار منعقد ہوا تھا، اس سیمینار میں مولانا اپنا مقالہ سنا رہے تھے، شرکاءِ جلسہ
ے ایک منظر دیکھا اور یہ منظر لوگوں کے قرطاسِ دل پر مرتسم ہو گیا، جب اس ذاتِ گرامی کا ذکر آیا
ں کی غلامی نہیں بلکہ اس کے غلاموں کی غلامی باعثِ صد افتخار ہے، تو مولانا کے دل کی دھڑکن تیز
ئی، آواز گلوگیر ہو گئی اور آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی، احساس کی شدت سے جسم کانپنے لگا اور
کے لیے مقالہ جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔

ایک آنسو اور اس میں داستان صد ملال — کتنے دریا قطرۂ شبنم میں لہرانے لگے

ایک معتبر راوی مولانا سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اقبال پر بات
رہی تھی میں نے ایک شعر پڑھا۔

مکن رسوا بہ پیش خواجہ مارا — حسابِ من ز چشم او نہاں گیر

مولانا کے چہرے کی کیفیات بدل گئیں، گریہ گلوگیر ہو گیا، بڑی مشکل سے آنسوؤں کو روکا۔''

(مقدمہ نگارشات)

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے عربی کی نعتیہ شاعری پر اپنے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت برادرِ عزیز مولوی عبد اللہ صاحب کیلئے مقدر فرمائی
تھی، جو ہمارے علم کی حد تک ان صفات سے متصف ہیں جو اس کتاب کی تالیف کے لیے
شرط ہیں، نیز خاندانی اور تربیتی لحاظ سے بھی اس موضوع سے فطری مناسبت رکھتے ہیں۔''

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس مقدمہ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اس
وضوع پر کام کرنے والے کے لیے سب سے اہم اور مقدم شرط یہ ہے کہ اس کو اس دولت بیدار
ے کچھ حصہ ملا ہو اور اس کو اس سے فطری مناسبت ہو، جس کے بغیر اس موضوع پر قلم اٹھانا ایک
نوعی کوشش ایک سعی لاحاصل سے زیادہ نہیں، یعنی ذاتِ نبویؐ سے محبت و عقیدت کسی نہ کسی

درجہ میں اس کے خمیر میں پیوست ہو اور اس کے عقیدہ کا جزء ہو۔ مولانا عبد اللہ عباس صاحب ندوی کی جو تحریریں اسی زمرہ میں آتی ہیں ان میں مشائخ پھلواری کی نعتیں اور ان کا وہ مفصل ادبی اور تنقیدی مقالہ بھی ہے جو انہوں نے محسن کاکوروی کے نعتیہ قصیدہ پر لکھا تھا اور جو ان کے مجموعۂ مقالات "نگارشت" میں شامل ہے۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محور پر گردش کرنے والے عظیم الشان مجموعۂ نگارشات کا مرتب کرنے والا ادیب اور عالم دین محسن کاکوروی کا ہم دعا اور ہم آواز نظر آتا ہے ؎

صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح | ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ، یہ غزل
کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ | "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل"

مولانا کی یہ تمام ادبی نگارشات اس بات کی دلیل ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے بابرکت موضوع پر جامعہ اسلامیہ دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد کے ناظم مولانا محمد رضوان القاسمی نے خطبات کے لیے جس شخصیت کا انتخاب کیا ہے، وہ موزوں ترین شخصیت ہے اور اس کو اس موضوع سے بقول مولانا ابو الحسن علی ندوی "فطری مناسبت ہے۔"

مولانا ابو الحسن علی ندوی نے "وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" (آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کر دیا) (الم نشرح ۹۴-۴) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ پیشین گوئی ہے اور اس میں کلمہ رفع ایک معجزہ سے کم نہیں، یہاں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے، اس میں لفظِ رفع اپنی تمام تفصیلات اور مضمرات کے ساتھ ہے، جس طرح آفتابِ عالم تاب نشیب و فراز، خشکی تری اور عالم و جاہل سب پر یکساں طریقہ پر چمکتا ہے، اسی طرح ذاتِ نبویؐ حسن و احسان کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، سب سے محبت کا خراج اور جمال و کمال کا باج وصول کرتی ہے، پھر اس مختصر آیت میں "ذِکر" کا لفظ آیا ہے، یوں تو "ذِکْرَكَ" کے بجائے اسمك بھی کہا جا سکتا تھا، لیکن دنیا میں ہزاروں انسان کے نام زندہ ہیں، لیکن وہ مجرد نام ہیں جن کے ساتھ اوصاف و کمالات، سوانح و حالات اور صفات و خصوصیات کا کوئی نشان نہیں۔ اس آیت میں صرف نام کے زندہ اور بلند رکھنے کی ضمانت نہیں دی گئی ہے، بلکہ ان کے تذکرہ کو پھیلانے اور اونچا کرنے کی بھی ضمانت دی گئی ہے اور قیامت تک کے لیے دی گئی ہے، کتابیں لکھی جاتی رہیں گی، خطبات کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، دنیا میں کسی کا نام اتنا بلند نہ ہوگا جتنا کہ یہ نام مبارک بلند ہوگا، جس کے نام کا ذکر ہے۔ "رفع" کا وعدہ تو اس کے لیے ہو چکا، لیکن اجازت دیجئے یہ کہنے کی کہ رفع درجات اس نام نامی اسم گرامی کے طفیل میں ان سب کے لیے بھی ہوگا جو ذکر کے اشتقاق کے دائرہ میں آتے ہیں، اس جگہ اس فعل ذکر کے اسم فاعل ذاکر کے لیے بھی ہوگا، یہاں یہ شخصیت

مولانا عبداللہ عباس صاحب کی ہے، رفع درجات مقام ذکر اور محفل ذکر کے لیے بھی ہوگا، جس کے دائرہ میں اس ذکر کا انعقاد کرنے والے مولانا محمد رضوان القاسمی اور اس میں شرکت کی سعادت رکھنے والے علماء اور دانشور، طلبہ اور استاذ سب آجاتے ہیں۔ کیسی شان ہے ان کی جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور اس نام کی برکت کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ رفع ذکر تو ان کا ہوگا جن کے لیے اللہ نے وعدہ فرمایا "رفعنا لك ذكرك" اور رفع درجات کی خوش نصیبی ان سب کو ملے گی جو اس کارذکر کی سعادت میں شریک ہوں گے، خواہ وہ ذاکر ہوں یا منتظم ذکر ہوں یا سامع ذکر ہوں۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی کے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس موضوع سے متعلق ان کی تحریروں کا ذکر کچھ تفصیل کے ساتھ ان کے خطبات سیرت کی وجہ سے آگیا۔ مولانا نے ایک جگہ خود اپنے اس ذوق وشوق کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ میر درد کے شعر میں ترمیم اس طرح کی ہے۔

لاکھ گر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا　　الجھے سلجھے اسی کاکل کے گرفتار رہو

بحیثیت عالم دین ان کی کئی کتابوں میں صرف ایک کا ذکر کافی ہے اور وہ ہے "قاموس الفاظ القرآن الکریم" جو عربی اور انگریزی میں ایک ضخیم کتاب ہے۔ کلام پاک کے الفاظ کی انگریزی میں یہ گلاسری یورپ سے شائع ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ خدمت قرآن کے موضوع پر ان کی کتاب "ترجمات معانی القرآن وتطور فہمہ عند الغرب" ہے، جسے رابطہ عالم اسلامی سے شائع کر کے بڑے پیمانہ پر دنیا میں تقسیم کیا ہے اور یہ کتاب بھی کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ ان کی ایک اور مقبول کتاب جو عربی اور انگریزی میں ہے وہ ہے: "تعلّم لغۃ القرآن"۔ قرآنیات کے موضوع پر ان کی ایک اور اہم کتاب ہے اور اس کا نام ہے: "مذاہب المنحرفین فی التفسیر"۔ مولانا کا یورپ کا سفر نامہ "چند دن دیار غیر میں" زبان اور حسن انشاء کے اعتبار سے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مولانا ایک عالم دین، عربی زبان کے ماہر اور ادیب ہیں۔ اگر مذکورہ بالا کتابیں مولانا کے قلم سے نکلیں تو ان کے مزاج اور ذوق کے مطابق تھیں، لیکن حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ اسی ادیب کے قلم سے فقہ اور منطق پر بھی کتابیں نکلیں ہیں، خاص طور پر منطق پر ان کی کتاب بے نظیر ہے اور اردو زبان میں اس سے بہتر کتاب موجود نہیں۔ کتاب کا نام ہے: "تسہیل المنطق"۔ یہ کتاب اسم بامسمیٰ ہے، جس کو دارالعلوم ندوۃ العلماء نے شائع کیا ہے اور متعدد مدارس اسلامیہ میں داخل درس ہے۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی جامعۃ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں پروفیسر اور رابطۂ عالم اسلامی کے انگریزی جرنل کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، اس سے پہلے ادارہ نشریات شرقیہ سعودی عرب کے انچارج اور

اس سے پہلے دار العلوم ندوۃ العلماء میں عربی ادب کے استاد کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں، اس وقت ندوہ میں معتمد تعلیم ہیں۔

جہاں تک ان کے ادبی ذوق اور ان کی انشاء پردازی کا تعلق ہے تو اس کا اعتراف مشہور صاحبِ اور اہل قلم حضرات کر چکے ہیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مشہور نقاد اور دہلی یونیورسیٹی کے استاد رہ چکے ہیں، انہوں نے لکھا ہے:

"اسلوب کے لیے ذہن متوازن، وجدان صحیح اور ذوقِ سلیم شرط ہے اور یہ دولت عبد اللہ صاحب کو دو طرف سے ملی ہے۔ وہ تاج العارفین حضرت شاہ مجیب اللہ قادری کی ساتویں پشت میں ہیں اور علم وعرفان اور احساسِ حسن وجمال کی دولت ان کو ارثاً ملی ہے، اسکے علاوہ حضرت قبلہ دیدہ ودل مولانا ابو الحسن علی ندوی سے رات دن کی قربت رہی ہے۔ اس نے ان کی تحریروں میں وہ حسن پیدا کر دیا ہے جو عام دسترس سے باہر ہے۔ ان کی تحریروں سے اسلوب کا نیا معیار سامنے آیا ہے۔ یہ طرزِ اسلوب نہ علامہ شبلیؒ جیسا ہے اور نہ مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسا، یہ عبد اللہ صاحب کا ہے اور ان ہی کی ایجاد ہے۔ انشاء کے قواعد ان کے ضمیر میں اس طرح جاگزین ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ ان کے ادراکِ صحیح، ذوقِ سلیم، غیر معمولی حافظہ اور جمالیاتی احساس نے ان کی تحریروں میں ابدیت کے جوہر پیدا کر دیئے ہیں۔ لفظ ومعنی کے شکنجہ میں فشار آغوش حسن کی یہ کیفیت غزل کی رمزیت پیدا کر دیتی ہے اور ہم اس سے بہت دیر تک لطف اندوز ہوتے ہیں، مجھے یقین ہے ان کے "ذکر و فکر" کے مضامین حلقہ شام وسحر سے نکل کر اردو نثر میں ایک مستقل جگہ حاصل کر لیں گے۔"

خواجہ احمد فاروقی کے ان اقتباسات اور اعترافات کے بعد ان کی انشاء پردازی کے موضوع پر کسی مزید اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہیں مولانا عبد اللہ عباس ندوی جنہوں نے مولانا ابو الحسن علی ندوی کی کتاب المرتضیٰ اور دوسری کئی کتابوں کے عربی سے اردو میں شگفتہ اور سلیس ترجمہ کی خدمت بھی انجام دی ہے اور جن کے اپنے ادبی اور علمی مضامین کا مجموعہ "نگارشات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ میدانِ ادب کے غازی، دنیائے علم کے رازی، وادی محبت ومعرفت کے فرہاد، امّ القریٰ یونیورسٹی کے سابق استاذ، زبان جن کی بر گوہر بار، قلم جن کا تیغ جوہر دار، چندے مقیمے حیدر آباد دکن، نزیل شہر علم وفکر وفن، سیرت سرورِ کونین کے موضوع پر اپنے خطبات پیش کرتے ہوئے!

☆☆☆☆☆

جذباتِ تشکر و امتنان

بخدمتِ عالی جناب محترم المقام فضیلۃ الشیخ حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی ـ زیدت فیوضہم
ینگ پروفیسر جامعہ امّ القریٰ، مشیر اعلیٰ رابطۂ عالم اسلامی، مکہ، معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
م : دارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد، بتاریخ ۲۳/ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
ارِ جذبات : مفتی محمد مصطفیٰ مفتاحی ـ پیش کش : انتظامیہ و اساتذہ دارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد

ے قسمت! ستر عالی ہمم گوہر فشاں آئے ☆ نیا جوشِ سفر لے کر امیرِ کارواں آئے
رِ میکدہ آئے ، بہارِ گلستاں آئے ☆ نبیؐ کے عاشق و شیدا ، امین و ترجمان آئے
، جنکے ادنیٰ جلوے پر ہزاروں کہکشاں قرباں ☆ مٹانے کے لیے ظلمت وہ رشکِ کہکشاں آئے
جن کی فلسفہ، منطق کی ہے تفہیم لاثانی ☆ وہی فارابی و رازی، وہی صاحبِ قراں آئے
ئیں کیوں نہ برسائیں، سرور و بہجت و فرحت ☆ ردائے رحمتِ باری لیے پیرِ مغاں آئے
پ اٹھے دیارِ غیر میں جو دین کی خاطر ☆ وہی دردِ دروں والے حرم کے پاسباں آئے
یک فن میں ہے طوطی بولتا جن کا زمانے میں ☆ وہی بازوئے حضرت بوالحسن شیریں بیاں آئے
ن ہفت میں جادو جگانا جن کو آتا ہے ☆ جنابِ زیدؒ کے پیرو وہی نازِ بتاں آئے
ہیں ہیں جامعہ امّ القریٰ میں کرتے گل ریزی ☆ خوشا! ندوے میں ہیں جو معتمد، وہ باغباں آئے
ئے جن کا سینہ ہے خزینہ علم و حکمت کا ☆ نکاتِ سیرتِ سرورؐ بتانے رازداں آئے
ں سے شاہدِ اردو نے پایا غازۂ جدت ☆ زہے! اردو کے محسن ذی شعور و مہرباں آئے
ت کی مچی ہے دھوم رندوں میں جہاں والو! ☆ یہ کیسا بادہ لیکے ساقیِ بادہ کشاں آئے
ئے جاتے ہیں بے خود دم بدم پروانے محفل میں ☆ نرالی شمع لے کر داعیِ عصرِ رواں آئے
ش قدح خواروں کا یہ ہے چھوٹا سا میخانہ ☆ تری آمد سے اس پہ واہ! کیسے خوش سماں آئے
ئے خطبات تو نے حیدر آبادِ دکن میں جو ☆ قسم ہے، وہ پئے سیرت عجب شرح و بیاں آئے

زمانہ یاد رکھے گا تیرے خطباتِ عالی کو ☆ نہ آئے کہنگی ان پہ ، نہ کچھ گردِ زماں آئے

عجب افتاد ہے مسلم پہ، حضرت! کس کو کیا کہیے ☆ دعا کیجیے کہ سب کو دین کا دردِ نہاں آئے

دعا کیجیے کہ ملت کے سبھی شاہیں عقابوں کو ☆ عطا ہو بال و پر ایسا کہ پروازِ جہاں آئے

عطا تدبیر و فکر و درد تیرا سب کو ہو جائے ☆ شعور و آگہی آئے ، خلوصِ بیکراں آئے

یقیناً تو ہے دانا، مردِ میداں، مردِ آخر بیں ☆ نگاہوں میں تیرے جیسا کوئی آئے کہاں آئے

ندامت ہے، تری ہم کچھ بھی مدحت کر نہیں پائے ☆ ہم ایسے عاجزوں کو کس طرح کلک و زباں آئے

خدا رکھے سلامت تجھ کو اے سالارِ قوم و دیں! ☆ دعا ہے کہ ترے بھی حصے میں خلدِ جناں آئے

خدایا! بھرے رضواں کے بھی داماں خاص نصرت سے ☆ انہی کی دعوتِ اخلاص سے یہ سارباں آئے

سلامِ شوق بھی ہے پیش اور اتنی گذارش بھی ☆ دعا کرنا جو تجھ کو یاد گہہ یہ گلستاں آئے

پیغمبرِ انسانیتؐ حیاتِ نو کا پیامی

مولانا ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ

(سورہ انفال: ۲۴)

اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل کرتے رہو، جب کہ رسول تم کو حیات بخش چیز کی طرف بلاتے ہیں۔

وہ حیات بخش چیز کیا ہے، جس کی طرف اللہ کے رسولؐ نے بلایا؟ بظاہر آخرت کی زندگی کی خوشحالی، یا روحانی زندگی کو کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ کے اسوہ پر چل کر، ان کی ہدایات کو مان کر، ان کے بتائے ہوئے راستے پر عمل کر کے آخرت کی نعمتیں حاصل ہو سکتی ہیں، وہ زندگی جو ہمیشگی کی اور دائمی ہے، جہاں بقا ہے فنا نہیں، جہاں کے نورانی جسم میں تغیرات نہیں آئیں گے، سدا بہار جوانی، سدا بہار عیش و کامرانی۔

لیکن آیتِ کریمہ کا جو رخ ہے وہ اس بات کو باور کرانا نہیں ہے، یہ مضمون دوسری آیات میں بے شک آیا ہے، مگر یہاں خاص اس آیت کا رخ دنیاوی زندگی کی طرف ہے، دنیا کی نعمتوں کی طرف، اس خاکی اور پابندِ عناصر زندگی کی طرف ہے۔ اللہ کا رسولؐ تمہیں اس امر کی طرف بلاتا ہے جس میں تمہاری زندگی ہے، وہ کیا زندگی ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب ابھی چند سطروں کے بعد آپ کے سامنے آئے گا۔ سردست

تاریخ اسلام کا ایک اہم واقعہ اور سن لیجیے، جس سے آیتِ کریمہ کے مضمون کی تصدیق ہوتی ہے۔ قادسیہ کی جنگ سے پہلے حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے ربعی بن عامرؓ کو اپنا خاص ایلچی

(سفیر) بنا کر فارس افواج کے کمانڈر جنرل حکمران 'رستم' کے پاس بھیجا۔ یہ وہی رستم ہے جس کا
انسانی قوت و جبروت کا رمز سمجھا جاتا تھا، جس کے بارے میں آپ نے وہ مصرعہ سنا ہوگا : "رستم
بدن زیر کفن کانپ رہا ہے۔" (۱) یہ وہی رستم تھا اور ادھر حضرت ربعیؓ بن عامر کھرے اور ٹھیٹھ مسلمان
بدویانہ فطرت پر ثابت قدم، شاہانہ جاہ و جلال کو خاطر میں نہ لانے والے، ایرانی سطوت کے پرو ٹو کو
کی نہ ان کے سامنے کوئی اہمیت تھی اور نہ ظاہری کر و فر کی ان کو پرواہ۔ اللہ کے جاہ و جلال سے جو آ
ہو گیا وہ دنیا والوں کے چند روزہ ٹھاٹ باٹ کو اپنے پاؤں کے گرد کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ حضر
ربعیؓ رستم کے ایوانِ شاہی میں اس شان سے پہنچے کہ سر پر لوہے کی خود، ایک ہاتھ میں تلوار، دوسر
ہاتھ میں ڈھال، چھوٹے قد کی ایک گھوڑی پر سوار تھے، ادھر ایوانِ شاہی، ایوانِ شاہی تھا۔

فارس کے حکمرانِ اعلیٰ کا دربار، مخمل اور دیبا کے فرش، دیواروں پر ریشم و کمخواب کے
پردے، پورے ہال میں سلیقے سے اونچے اونچے مسند لگے ہوئے، جو مصاحب و وزراء جاتے باب عالی
سات سلام گزار کر سر جھکاتے، لرزاں و ترساں حاضری دیتے؛ لیکن ادھر رنگ ہی اور تھا، جیسا کہ بتا
گیا چھوٹے قد کی معمولی سی گھوڑی پر سوار موٹا جھوٹا لباس پہنے، مسلمان کمانڈر کے ایلچی آرہے تھے
دربانوں نے روکا اور کہا کہ آگے بڑھنے سے پہلے اپنے ہتھیار رکھ دیں۔ حضرت ربعیؓ نے انکار کیا او
کہا : میں بلایا ہوا آیا ہوں، اگر تم کو میری وضع پسند نہیں تو واپس جاتا ہوں۔ رستم نے دور سے یہ منظ
دیکھا اور اشارے سے حکم دیا کہ ان کو آنے دو۔ حضرت ربعیؓ اپنے نیزے سے ٹیک لگاتے اس وقت کے
اعلیٰ ترین نمارق کے فرش پر بڑھے۔ نیزے سے فرش ایک دو جگہ سے بچ گیا۔ پوچھا گیا : ماجاء بکم
تم کس لیے آئے ہو؟ بلا تامل جواب دیا : کہ اللہ نے ہم کو اٹھایا ہے، (اللہ ابعثنا) تاکہ ہر اس شخص کو
جسے پسند ہو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی
وسعت میں لے آئیں، مذاہب کے ظلم و ستم سے نکال کر اسلام کے دامن عدل میں جگہ دیں، ہم
اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اس کا دین اس کی مخلوق تک پہنچا دیں، جس نے اس دعوت کو قبول کیا، ہم اس
کی پیش قدمی کو قبول کرلیں گے اور واپس چلے جائیں گے اور جس نے انکار کیا اس سے ہماری ہمیشہ کے
لیے جنگ ہے، یہاں تک کہ اللہ کا کیا ہوا وعدہ پورا ہو جائے۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ وعدۂ الٰہی کیا ہے

(۱) غالباً دبیر کا ایک بند ہے :

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے — رن ایک طرف، چرخ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے — ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبرئیل لرزتے ہیں سمٹے ہوئے پر کو

فرمایا : جنت، اگر وہ اس جنگ میں ہلاک ہو جائے اور کامرانی اس کے لیے جو بچ جائے(۲)

اس تقریر میں حضرت ربعیؓ کا یہ فقرہ کہ "بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت، دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت میں پہنچانا" بہت معنی خیز اور تشریح طلب بات ہے۔ اوپر آیت میں فرمایا گیا تھا "لِمَا يُحْيِيكُمْ"، یعنی رسول اللہ تم کو زندگی کی دعوت دیتے ہیں اور یہاں اسلام کا ایک ایلچی اسی بات کو دہرا رہا ہے کہ دنیا کی تنگی سے نکالنا ہمارا مقصد ہے۔ اس بات کو ذہن نشین کرنے کے لیے ہمیں تاریخ کے اور موجودہ زمانے کے حالات کا ایک سرسری جائزہ لینا ہوگا، ورنہ بات شاید مبہم رہ جائے اور یہ سمجھ میں نہیں آئے گا کہ زندہ انسانوں کو زندگی کی دعوت، کیا معنی رکھتا ہے اور جو اس وسیع دنیا میں ہماری آپ کی طرح سانس لے رہے ہیں، کھلے آسمانوں کے نیچے اور کشادہ زمین کے اوپر، ان کو اس کے علاوہ کون سے وسعت درکار ہے، جس کی طرف بلانے کے لیے اللہ نے اپنے پیغمبر برحق کو مبعوث کیا؟

دنیا خواہ اُس وقت کی ہو، جب چھٹی صدی عیسوی میں آفتابِ رسالت نمودار ہوا تھا یا اس دور کی جبکہ تمدن کا عروج اور انکشافات وایجادات کی کثرت نے آنکھیں خیرہ کر رکھی ہیں، اس وقت سے لے کر آج تک نوعِ انسانی ایک نفسیاتی کشمکش اور سماجی قید و بند میں گرفتار ہے، انسانوں کو ان کا پیدائشی حق کبھی نہیں ملا، اس کی کوششیں بارہا کی گئیں، اس کے منصوبے بنے، نقشۂ عمل تیار ہوا، تحریکیں اٹھیں کہ ہر انسان کو مساوی طور پر انصاف پر مبنی پیدائشی حق ملے، لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ آیئے تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیں۔

حکمائے چین کی کاوش

غالباً اہل چین کا اوّلین صحیفہ "اصول دوّیہ" کے نام سے مشہور ہے، جس کی دعوت یہ تھی کہ زندگی کو فطری بہاؤ پر چھوڑ دیا جائے اور ایسے قوانین وضع کیے جائیں جو فطری نظامِ حیات کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ ڈاکٹر معروف الدوالیبی "السلام العالمی والاسلام" میں لکھتے ہیں :

قدیم چینی مذہب "دوّیہ" دوء سے نکلا ہے، جس کا ترجمہ طریقہ یا راستہ ہے اور اس سے مراد لیا جاتا ہے 'فطرتِ انسانی کی راہ' یا وہ اصول جو حکیمانہ مصالح کی بنا پر وضع کر دیئے گئے ہیں۔ اس مذہب

---

(۲) یہ واقعہ البدایہ والنہایہ کے حوالہ سے مخدوم و مربی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنی ایک تقریر "المدّ و الجزر فی تاریخ الاسلام" میں نقل کیا ہے، جو آپکی تقریروں کے مجموعہ "إلى الإسلام من جديد" شائع کردہ دارالقلم دمشق میں موجود ہے۔ اس واقعہ میں جو ایمانی جسارت اور آپ کے دین پر اعتماد کا پہلو ہے، غالباً اسی وجہ سے آپ نے اپنی متعدد تقریروں کا موضوع اس واقعہ کو بنایا ہے۔ جزاہ اللہ خیراً

کا بانی "لودزہ" ہے، جس کو معبودِ حکمت قرار دیا گیا تھا اور اس کی پوجا ہوتی تھی۔ اس کا قول ہے کہ:

فطرت نے گذشتہ زمانوں میں زندگی کو پر امن بنا دیا تھا اور سارا عالم آسودہ اور خوش حال تھا پھر وہ زمانہ آیا کہ لوگوں نے علوم حاصل کیے اور ایجادات نے زندگی کو ایک گتھی بنا دیا، جس سے انسان اپنی فکری اور اخلاقی جوہر سے محروم ہو گئے اور کھیتوں سے نکل کر شہروں میں آباد ہو گئے، کتابیں تصنیف کی گئیں اور یہی علوم اور یہی کتابیں انسان کی فطری زندگی کی دشمن ثابت ہوئیں، جنھوں نے مزاج کے اندر شک اور انحراف پیدا کر دیا، لہٰذا عقل مند وہ ہے جو تمدن کے تقلیدی طریقوں سے دست بردار ہو جائے اور آغوشِ فطرت میں پناہ لے، عقل و حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ فطرتِ اصول کے اتباعِ کامل کو اپنا شعار بنا لے اور علوم و فنون کی پیدا کردہ الجھنوں سے ذہن و دماغ کو یکسر پاک کر لے اور فطری خواہشات جس براہ پر چلائیں ان پر چلے، فطرت کی خاموش آواز پر لبیک کہے اور بغیر تمدنی آلودگیوں کے اس طرح آزاد رہے جیسے جنگل میں چوپائے رہتے ہیں، نہ کسی کا شکار کرے اور نہ خود کسی کا شکار بنے، درختوں کی طرح اس فطری طاقت کے مطابق بلند ہو، چڑیوں کی طرح جس ٹہنی پر چاہے اپنا نشیمن بنائے، مچھلیوں کی طرح بغیر خوفِ صیاد کے آزادانہ پیرا کرے۔

اس چینی معبود کے ملفوظات جو دولوں کے مندروں میں شیشوں پر کندہ ہیں، ان میں یہ بھی ہے:

غور و بحث ایک سطحی اور غیر اخلاقی مرض ہے، اس سے سوائے جھگڑوں کے کوئی حاصل نہیں ہے، علم کوئی بڑائی کی بات نہیں ہے، سفلہ پن اسی وقت سے بڑھا ہے جب سے علم کا پھیلاؤ شروع ہوا۔

ہندوستان کا طبقہ واری نظام چین کی بہ نسبت کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا، ہندوستان میں اس وقت منو کی حکومت تھی، منو لقب رکھنے والے سات حکمراں گذرے ہیں، جس طرح شاہانِ مصر قدیم کا خاندانی لقب فرعون تھا، ایرانی سلاطین کسریٰ اور رومی حکمراں قیصر کہے جاتے تھے، اسی طرح ہندوستانی شاہانِ وقت منو کا لقب رکھتے تھے، منو اوّل براہِ راست براہیم کے اولاد سے تھے، اس نظام میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا حق صرف برہمن کو تھا، حساب کتاب کی تعلیم چھتری پاتے تھے، زراعت پیشہ اور تاجر کو تعلیم سے دور رکھا جاتا تھا اور اچھوت کے لیے تعلیم حرام تھی، دوسری صدی عیسوی کے وثائق بتاتے ہیں کہ سرداری کا حق صرف برہمن کو تھا، ان پر کسی قسم کا ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا تھا، خواہ حکومت کا خزانہ خالی ہو، ان کی تقدیس واجب تھی، اچھوت پیدا ہی اس لیے ہوئے تھے کہ وہ چاکری کریں، اس وقت کا نظامِ معاشرت تقسیم طبقات پر قائم تھا۔(۱)

(۱) الاسلام السلام العالمی / ۱۳۹ مطبوعہ قاہرہ از ڈاکٹر معروف الدوالیبی

یونانیوں اور رومیوں کے نظامِ معاشرت میں فرد کا مقام

یورپین قومیں جو شمال و مغرب کے اندر دور تک آباد تھیں، جہالت اور ناخواندگی کے سایہ میں تھیں۔ روبرٹ بری فالٹ Robert Briffault لکھتا ہے :

"پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یوروپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور تاریکی تدریجاً گہری اور بھیانک ہوتی جارہی تھی، اس دور کی وحشت و بربریت زمانۂ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ بڑھی چڑھی تھی، کیوں کہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی جو سڑ گئی ہو، اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی، یہاں طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔" (۱)

ڈاکٹر معروف الدوالیسی لکھتے ہیں :

"روم اور یونان میں علوم و حکمت کے حصول کا آغاز دوسری صدی عیسوی سے ہو چکا تھا، مگر حکمران طبقہ کی خواہشات اور انکی سیاست و مصلحت کے مطابق ہی افراد ترقی کے میدان میں آسکتے تھے، ہندوستان کی جیسی طبقہ واریت تو نہ تھی، مگر حاکم و محکوم دو طبقے حقوقِ انسانی میں یکساں نہ تھے۔" (۲)

ارسطو اس وقت کے حالات کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے :

"ساری زمین صرف چند افراد کی ملکیت تھی، کسان اپنے آپ کو، اپنی بیوی اور بچوں کو غلاموں کی طرح فروخت کرتے تھے، صرف ملک کے اندر ہی نہیں بیرونِ ملک بھی انسانی نفوس کی سپلائی پر مجبور کیے جاتے تھے، تاکہ زمیندار طبقہ کا لگان ادا کرسکیں۔" (۳)

ماضی بعید سے اب ہم ماضی قریب کا ایک جائزہ لیں، تاکہ یہ دیکھیں کہ کیا انسان کو اس کا پیدائشی حق کسی اور وضعی نظام میں حاصل ہو سکا ہے یا نہیں؟ اٹھارہویں صدی کے آخر میں انقلابِ فرانس نے یوروپ کے جاگیردارانہ نظام کو یوروپ سے ختم کردیا، اس کے بعد دنیا کو دو قسم کے نظام کا سابقہ، یوں کہیے کہ دو نعرے بلند ہوئے، ایک ڈیموکریسی (جمہوریت) کا اور دوسرا اشتراکیت کا، ان دونوں نظاموں میں مشترک بات یہ تھی کہ یہ دعویٰ کیا گیا کہ انسان کو سوسائٹی کے مظالم سے نجات مل جائے گی اور انسان بحیثیتِ انسان کے مساوی حقوق حاصل کرسکے گا، کوئی طبقاتی اونچ نیچ باقی نہیں رہے گی، لیکن اس دعوے کی حقیقت سمجھنے کے لیے ہم ان دونوں تحریکوں کا انجام اس طرح دیکھ سکتے

(۱) نبی رحمت : ۶/ (اردو) از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۲) السلام العالمی : ۱۳۸/۱۱ (۳) ایضاً ۱۸۴

ہیں :ڈیموکریٹک سسٹم بالغوں کی رائے دہندگی پر قائم ہے، جن کو پانچ سال میں ایک مرتبہ اپنی رائے دینے کا اختیار ہوتا ہے، اگر کسی ملک کی سربراہی کے لیے پانچ پارٹیاں یا چار پارٹیاں میدان میں اتری ہیں تو اکیس فیصدی یا زیادہ سے زیادہ پچیس فیصدی ووٹ خریدنے والے افراد یا جماعتیں حکمرانی کی کرسی حاصل کرلیتی ہیں اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے، وہ ایک محدود افراد کی کمیٹی انجام دیتی ہے پارلیمنٹ میں ہاتھ اٹھانے والے زیادہ اور رائے دینے والے کم ہوتے ہیں، سب سے بڑی کامیاب جمہوریت برطانیہ کی سمجھی گئی ہے، اس کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ کامیاب پارٹی کے صرف دو تین نفر ملک اور عوام کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں اور بقیہ اس بات پر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ وہ حکمراں طبقے کے ایک فرد ہیں، شاہی حکومتوں میں اگر شہزادے دادِ عیش دیتے ہیں، تو جمہوریت میں ممبرانِ پارلیمنٹ شاہزادوں کی جگہ لے لیتے ہیں، عوام اور اہل کار محنت کرتے ہیں اور ان کی محنت کا ثمرہ ایک خاص طبقہ حاصل کرتا ہے، اگر سیاست کی چلمن اٹھا کر دیکھئے تو وہی شہنشائیت نمایاں ہوگی، شاہی حکومتوں میں حکمراں پورے ملک کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور اس کو اپنی اولاد کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، وہ ملک دوسروں کے ہاتھ فروخت نہیں کر سکتا تھا، اپنے راز دشمن کے ہاتھ بیچ نہیں سکتا تھا، کیوں کہ اس کو اپنی اولاد کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہونا تھا، ایک کامیاب صدر جمہوریت یا وزیر اعظم یہ جانتا ہے کہ میری حکومت چند روزہ ہے، لہٰذا جتنا بھی اس پھل کو نچوڑ سکے، نچوڑ لے، عوام بدستور غلام اور پابند چلے آرہے ہیں، ان کو جمہوریت نے سوائے کھوکھلے نعروں کے کچھ بھی نہیں دیا اور بنی نوعِ انسان اپنی ہی جنس نوعِ انسان کا شکار ہی رہا اور جاگیردارانہ نظام کا ایک فریب دماغوں پر محیط ہو گیا، مگر بات فیشن اور رواج کی ہے، اس لیے لفظ جمہوریت کا ہے اور حقیقت بدترین ظالمانہ شہنشاہیت کی ہے، آج مشرقِ وسطیٰ کے جو ممالک اپنے کو جمہوری کہتے ہیں اور مشرق کے قریب کی حکومتیں بھی اپنے آپ کو جمہوری کہتی ہیں، لیکن عوام کے رجحان و مزاج اور ان کی طلب کے خلاف چند مٹھی بھر افراد فوجی طاقت کے بل پر اپنی من مانی کر رہے ہیں، اسی طرح سیکولرزم بھی ایک معمہ بن کر رہ گیا ہے، موجودہ ترکی میں ہر وہ بات جس میں دینی آمیزش ہو اس کو مٹانا سیکولرزم کہلاتا ہے اور کہیں تو الیکشن کے ڈرامے بھی انتہائی رسوائی کے ساتھ دفن ہو گئے اور رائے دہندگی کا ڈھونگ بھی نہیں چل سکا، فوج نے زبردستی الیکشن بند کرادئے، کیوں کہ حکامِ اعلیٰ کی شکست متوقع تھی، یہ جمہورت کا حال ہے اور فرد کی آزادی کا یہ حال ہے کہ ترکی میں کوئی مسلمان لڑکا یا لڑکی اپنی مرضی کا لباس نہیں پہن سکتا، لیبیا میں چند ہفوات کو تقدس کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اب تفصیل کہاں تک بیان

کی جائے، بے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں۔

السلام العالمی

ایک فرنچ کتاب کا عربی میں ترجمہ ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ انسان کس درجہ اخلاقی پستی کا شکار اور ظلم و طغیان کا خوگر تھا، اس کا مداوا کس طرح کیا جائے؟ ظالم کا ہاتھ کس طرح روکا جائے، اس کی بڑھتی ہوئی اور نہ ختم ہونے والی ہوسناکیوں پر کس طرح پہرہ بٹھایا جائے؛ لیکن جو قانون بھی تجویز کیا گیا وہ اگر ایک خرابی کو دور کرتا ہے تو دوسری متعدد خرابیاں سامنے آجاتی ہیں، ان ثمرات کا حال آج کل کے طب مغربی کی طرح تھا، ایک دوا اگر درد کو روک دیتی ہے تو دوسرے اثرات جسم پر ایسے مرتب ہوتے جو اس کے لیے دوسرے امراض کا پیش خیمہ بنتے ہیں، غریب اور نادار طبقے کو دولت مندوں کی دولت میں شریک کیا گیا تو غربت سے خوشحالی کی طرف آنے والے طبقوں میں وہی اناری اور سرکشی پیدا ہو گئی، وہ پہلے شاکی تھا اور ایک مزید طبقہ پیدا ہو گیا، جو اس نئے دولت مند طبقے کا شکار بن گیا۔ غرض ع

ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

ہمارے زمانے میں بھی نئے نظام اور اصول مرتب ہوئے، کہ انسان کو سوسائٹی میں برابری کا درجہ دیا جائے، جمہوریت (ڈیموکریسی) کو ایک زمانہ میں ہر مرض کا مداوا سمجھا گیا کہ برسہا برس کے تجربات کے سامنے انسانی عقل تھک کر بیٹھ گئی، ہر انسان کو اس کا حق دلائے گی، جستجو میں ایسا نظام سامنے آیا جس میں کسی کا بھی حق محفوظ نہیں، بقولِ علامہ اقبالؒ کے شہنشائیت کے چہرے پر جمہوریت کی نقاب ڈال دی گئی۔

ایک مہذب اور ہر طرح سے مکمل دستوری ڈھانچہ ایسا تیار ہوا جس میں مہذب انسان کو فریب اور دھوکہ بازی کے سوا کچھ نہ ملا، ایک دو یا اس سے زیادہ سربر آوردہ طبقات نے تمام طبقات کے حقوق چھین کر اپنی تجوریاں بھر لیں، ٹیکس کی بہتات شاہی دور سے بڑھ گئی، پہلے ایک شاہی خانوادہ اور اس کے بہی خواہ عوامی دولت کا استحصال کرتے تھے، اب کئی سو افراد مل کر اس سے زیادہ انسانی قوت و محنت کا استحصال کرتے ہیں، پہلے نوابوں اور راجاؤں کا دور دورہ تھا، جمہوری نظام میں وزرائے عالی مقام نے وہ پوزیشن سنبھال لی۔

اشتراکیت کا بھرم بھی کھل چکا ہے، ایک خونی ڈرامہ جو ستر سال تک جمہور کے نام پر جمہور کو جانوروں کی سطح پر رکھنے کا چل رہا تھا، وہ ختم ہوا اور جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے، اس کی تفسیر ہر

ملک میں نئی ہے۔

ایک اشتراکیت جرمن وطن پرستوں کی تھی، جو نازی حکمرانی کے زیر سایہ پلی بڑھی اور تاریخ کی تاریکیوں میں گم ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہے کہ سوویت یونین کی اشتراکیت اور نازی اشتراکیت کے درمیان سخت جنگ تھی۔

ایک وہ بھی اشتراکیت تھی جو مارشل ٹیٹو کو تازندگی حکمراں قائم رکھنے کے لیے ایجاد کی گئی تھی اور چین کی اشتراکیت اپنے رنگ کی نئی چیز ہے۔

ان سب اشتراکیت کے دعویداروں نے جس بات کا پروپیگنڈہ کیا اور جس نے غریبوں کے اعصاب پر حکومت کی، ان کا مشترک دعویٰ یہ تھا کہ کسی ایک سوسائٹی یا حکومت پر قابض طبقے کی غلامی سے فرد کو آزادی ملے گی اور اصل دولت سونے چاندی کے سکے نہیں ہیں، بلکہ انسان کی محنت ہے، دنیا میں جو بھی ترقی ہوئی ہے، سب مزدور طبقہ کی دین ہے، جو دنیا کو اپنا خون پسینہ بہا کر عیش و عشرت کا سامان مہیا کرتا ہے، وہ کسان جو کھیتوں کو جوتا ہے اور بوتا ہے، یہ اس کی محنت کا پھل ہے، جو امیروں کے دستر خوان کی زینت بنتا ہے، اس کا وہ ہل ہے جو بقولِ جوش "اس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمین" لہٰذا مزدور کو اس کا حق ملنا چاہیے۔

کتنا خوشنما یہ نعرہ تھا اور کس درجہ پرفریب تھی یہ سازش!! مگر کیا اسی آسمان نے روس کی سرزمین پر ایک دن کے لیے وہ زمانہ پایا جہاں مزدور حکمراں ہوں، ہاں مزدوروں کے لیے راشن مقرر ہوگیا، جس طرح گائے بھینس پالنے والے جانوروں کو چارہ پانی دیا کرتے ہیں۔

افریقہ کے براعظم میں بھی انسان بسا کرتے تھے اور اب بھی بستے ہیں، ان کا یہ جرم کہ ان کی جلد کی رنگت سیاہ ہے، اس کی سزا جوان کو دی گئی، اس کو سن کر بھیڑیا بھی شرمندہ ہوجائے۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا نیگورز کے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے کہ ان کو یورپین قومیں نائجریا درگنڈا، نیجر اور جزائر القمر سے اس طرح شکار کیا کرتی تھیں جیسے جنگلی جانوروں کا شکار ہوتا ہے، ان کو ریل کے ڈبو میں بھر کرلے جایا کرتے تھے، جس میں کتے، بھیڑیے، بیل، گھوڑے بھرے جاتے ہیں، سب کی کمریں ایک رسّی سے بندھی ہوتی تھیں اور جب بندرگاہ سے کشتیوں میں بھرے جاتے، تو وہ بھاگ کر پانی میں ڈوب جانے کی کوشش کرتے، ایک افریقی جب اس میں کامیاب ہوگیا اور ڈوب کر مرنے لگا تو اس نے اپنی فتح سمجھی اور خوشی سے اپنا انگوٹھا دکھانے لگا کہ ہم تمہارے شکنجہ سے نکل کر آزادی کی موت مر رہے ہیں، ان افریقی باشندوں کو مار کر زہریلی دواؤں کا تجربہ کیا جاتا تھا، ہارورڈ یونیورسٹی کے

جغرافیہ کی لائبریری میں آج بھی افریقہ کے دو نقشے ہیں، جو ایک افریقی کو مار کر اس کے چمڑے پر بنائے گئے تھے، اسٹیشنوں پر ان کو ایک کونے میں جال کے اندر رکھا جاتا تھا، ایک گوری رنگت کا آدمی فریقہ کے کالے آدمی کو جب چاہے بہ سبب یا بلا سبب اگر مار ڈالے، اس کے کان، ناک کاٹ ڈالے تو کوئی جرم کی بات نہ تھی، ان کو اپنے جوڑے سے اس طرح ملایا جاتا تھا جس طرح سانڈ کے سامنے گائیں لائی جاتی ہیں، شادی کے موقعہ پر روشنی کے لیے ان کی کھوپڑی اوپر سے چھیل دی جاتی اور آگ لگادی جاتی، اس کے سر سے شعلے نکلتے جس سے روشنی ہوتی اور مہمان کھانا کھاتے۔

ممکن ہے کوئی کہے یہ باتیں پرانے زمانے کی ہیں، اب تو نہایت مہذب دنیا ہے، اب بجلی کی روشنی میں وہ رہتے ہیں، پختہ ہوادار مکان میں رہتے ہیں، اپنی مرضی کا کھانا کھاتے ہیں اور امریکی صدر براہام کی اصلاحات کے بعد حالات بدل گئے، اور اسی وجہ سے ابراہام کو امریکیوں نے قتل کر دیا تھا کینڈی سے پہلے بھی صدر کو جو اپنی صدارت کے زمانہ میں قتل کیا گیا، لیکن اب فرق آگیا ہے، یہ لاکھوں کالوں کو اتھوپیا سے نکلنے والی مشنریاں جو عیسائی بناتی ہیں، کیا ان کو انسانی حقوق دیتی ہیں؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان کو گوروں کے قبرستان میں دفن ہونے کا حق نہیں ہے، ان کا گرجا الگ ہے، ان کے پادری الگ ہیں، کالوں کا لارڈ اور ہے، گوروں کا اور کیا ساؤتھ افریقہ میں پانچ سال پہلے تک دونوں کے ہوائی اڈے، ریلوے پلیٹ فارم، رسٹورنٹ ہوٹل الگ الگ نہیں تھے؟ ان کو تعلیم کی سہولت کی یسی دشواریاں حائل کر دی گئی تھیں کہ کوئی افریقی تعلیم حاصل ہی نہیں کر سکتا تھا، مثلاً ایک گاڑی سے پندرہ میل کی دوری پر جو پرائمری اسکول ہے، اس میں ایک بچہ داخلہ لے سکتا تھا اور سواری کا کوئی نتظام نہیں، اس کے گاؤں میں جو اسکول تھا وہ ان لڑکوں کے لیے تھا جن کے مکانات پندرہ بیس میل دور تھے، دو افریقی آپس میں بات نہیں کر سکتے تھے، ایک گھر میں اگر دو افریقی ملازم ہیں تو رات کو وہ ایک جگہ نہیں سو سکتے تھے، ابھی چند ہفتے پہلے جنوبی افریقہ کے پہلے صدر منڈیلا جو سبکدوش ہوئے ہیں ان کو ۲۸ سال جیل میں رہنا پڑا۔

دنیا کی تنگی سے دنیا کی وسعت کی طرف لانے والا دین اسلام ہے، جو ان کو صرف کلمۂ شہادت کے بعد اپنا بھائی، اپنا رشتہ دار ہی نہیں، بلکہ اگر وہ دین کا علم حاصل کرلیں تو مسجد کے امام، مدرسہ کے مفتی اور شہر کے قاضی بن سکتے ہیں، پہلے ہی دن سے آپ کے پہلو میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اب کوئی بتائے کہ "اسلام کی وسعت" کی جو بات ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے کہی تھی اور قرآن نے کہا تھا: "اسلام تم کو اس دین کی طرف بلاتا ہے جو زندگی کی کامیابی ہے، کیا حرف بہ

حرف صحیح نہیں ہے اور حساب کے ارقام کی طرح نمایاں حقیقت نہیں ہے؟

غرض انسان کے بنائے ہوئے "چینی دیوی" نظام میں جو ما قبل مسیح (علیہ السلام) چین میں تھا اور جو بیسویں صدی کے نصفِ آخر میں روس میں تھا، عوام کی قسمت یکساں تھی اور آج بھی یکساں ہے۔

اور ان حقائق و ارقام پر نظر ڈالئے تو پتہ چلتا ہے کہ آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے قرآن نے جو دعوت دی تھی کہ اس دین کو قبول کرو جس میں تمہارے لیے زندگی کا پیغام ہے، آج بھی اسی عالم کی انسان کو جستجو ہے، جہاں وہ دنیا کی تنگی سے دنیا کی وسعت کی طرف اور مذاہبِ عالم خواہ تحریف شدہ آسمانی ہوں یا انسان کے بنائے ہوئے کے مظالم سے نجات دلائے گا، ذریعہ صرف وہ دین ہے جو نبی برحق سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے۔

ہم اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبر نہیں ہیں، ہمیں بھی ایجادات و اکتشافات نظر آتے ہیں، جو دنیا کی نگاہ خیرہ کر رہی ہیں، ہم فیکس اور انٹرنٹ کی برق رفتاری کو دیکھ رہے ہیں، مگر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ان ایجادات نے انسان کو اتنا فائدہ نہیں پہنچایا ہے جس قدر ان سے نقصانات ہوئے ہیں، ٹی وی، کے ذریعہ دہلی کے واقعات ہم دیکھ رہے ہیں، انٹرنٹ کے ذریعہ پورا کتب خانہ ہمارے دسترس میں آگیا ہے، مگر بقولِ قدیم حکمائے چین کے اس درجہ سفلہ پن بھی پھیل گیا ہے، آج ان آلات کے ذریعہ پوری نسل دماغی طور پر جرائم پسند بن گئی، (Crimenal Minded) ہو گئی ہے، صرف خبریں اور کتابیں ان ذرائع سے نہیں مل رہی ہیں، ان کے ساتھ رذائل کا ایک سیلاب بھی گھر گھر میں داخل ہو گیا ہے، ضروریاتِ زندگی کی وہ بہتات ہو گئی ہے کہ ہر ملازم پیشہ مقروض ہے، سود کی وباء اس قدر عام ہے کہ کوئی شخص چائے کی ایک پیالی بھی پیتا ہے اس میں سود کا تخم موجود ہے، وہ مزارعین جو گنے اگاتے ہیں ان کو زرعی بنک سے قرض لینا پڑتا ہے، اس میں سود داخل ہوتا ہے، پھر ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک جب یہ شکر برآمد کی جاتی ہے، اس میں انشورنس لازمی جزء ہوتا ہے، تھوک فروش قرض پر مال لیتے ہیں، وہ بھی سود ادا کرتے ہیں، غرض آپ کی پیالی میں چمچے دو چمچے شکر بھی اس وقت پہنچتی ہے جب کہ اس پر سود کے کئی مرحلے گذر چکے ہوتے ہیں۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِی النَّاسِ

لوگوں کے کرتوت سے بگاڑ خشکی اور تری پر پھیل گیا۔

فساد ہواؤں میں پھیل چکا ہے، خشکی میں فساد ہے، سمندروں میں فساد ہے، ضروریاتِ زندگی

کی بہتات اور آمدنی کی کمی، ہر انسان کو مجبور کر رہی ہے کہ آیا قرض لے، یا رشوت لے، یا کوئی ایسا کاروبار کرے جس میں بے ایمانی کا دخل ہو، ٹی وی اور اب انٹرنٹ نے مسافتیں کم کر دی ہیں، ان سے خیر اتنا نہیں پھیل رہا ہے جس قدر شر عام ہو رہا ہے۔ امریکہ میں رہنے والے دوستوں نے بتایا کہ قسط پر ادھار فیشن اور نمائش کی چیزیں، کاریں، فضائی سفر کے ٹکٹ ملتے ہیں، ان کا نام Never Never ہے، جس سے کوئی گھر خالی نہیں ہے، زندگی بھر قرض لیتا رہتا ہے اور اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ قرض میں کٹاتا رہتا ہے، زندگی ایک عذاب بن چکی ہے، مگر نام اتنے خوشنما ہیں کہ کوئی برائی کو برائی نہیں سمجھتا۔

اس تمدن میں عورت کو بظاہر بہت اہمیت دی گئی ہے اور آزادئ نسواں کے پر فریب نعرے سے اس کو مسحور کیا گیا ہے، مرد اس کی نسائیت کا ہر طرح سے استحصال کرتے ہیں، اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے اس کے جسم کی نمائش کرتے ہیں یوروپ اور امریکہ میں بے حیائی اور فحاشی کے اڈے رقص برہنگی کے مظاہرے اسی سے کراتے ہیں اور اسی کے ذمہ یہ کام بھی ہوتا ہے کہ بڑے بڑے نائٹ کلب کا انتظام کرے اور اس کی آمدنی مرد کی جیب میں جاتی ہے، اس کی نسوانیت چھین لی گئی، اس کے قدرتی حسن و جمال کو مسخ کر دیا گیا، اب سڑکوں کو دھونے، پلیٹ فارموں اور ہوائی اڈوں پر چھکڑے بھی وہی چلاتی ہے اور اس کے ساتھ اس کے طبعی وظائف امومت و رضاعت میں مرد ہاتھ نہیں بٹا سکتا، البتہ وہ مردوں کے دوش بدوش بسوں میں ٹکٹ چک کرتی، پارسل اٹھاتی اور ہر کام جو مردوں کے دستِ بازو کے رہینِ منت تھے، آج اس مخلوق کو کرنا پڑتا ہے، ہر عورت مالکہ اور وزیر اعظم نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے، مگر محنت مزدوری کا کام اس کو کرنا پڑتا ہے، غرض اس تمدن نے عورت کو قرونِ مظلمہ سے زیادہ رسوا کیا۔ یہ موضوع مستقل اور مفصل گفتگو کا ہے اور علماء و دانشوروں نے مستقل بحثیں لکھی ہیں۔

اسلام نے زندگی کا پیغام زندگی کے ہر میدان میں دیا ہے۔ اس کا نظامِ عقوبت بھی عدل پر قائم ہے، وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ، قتل کا بدلہ قتل عادلانہ نظام ہے، کیوں کہ اس سے قاتلوں کی ہمت شکنی ہوتی ہے اور دوسروں کو عبرت ہوتی ہے، وہ جرمِ قتل کے ارتکاب پر ڈھیٹ نہیں ہوتا، برخلاف رومن قانون پر چلنے والی عدالتوں میں ہر جرم کی پرورش ہوتی ہے، اس طرح سے جرائم بڑھتے ہیں، کیوں کہ قاتل کو معلوم ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ اس کو سزا ملے، چھوٹ بھی سکتا ہے، سفارش، رشوت اور وکلاء کی مہارتوں سے ہزاروں قاتل بچ گئے اور سیکڑوں بے گناہ مارے گئے، چور کی سزا اسلام نے جو مقرر کی ہے، اس پر ساری دنیا میں واویلا ہے، اسلامی قانون کو جنگل کا

قانون، بے رحمی اور شقاوت کا عنوان دیا جاتا ہے، فقہاء نے حد بندی کر دی ہے کہ جرم کی شدت اور نوعیت دیکھ کر قاضی فیصلہ کرتا ہے کہ کسی خاص واردات میں گرفتار شدہ چور سے کیا معاملہ کیا جائے اور اگر ایک کا ہاتھ کاٹا گیا تو برسہا برس کوئی ایسا جرم کرنے کی ہمت نہیں کرتا، سعودی عرب میں جہاں اسلامی قوانین نافذ ہیں، وہاں دس پندرہ برس میں کہیں ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے اور ایک واقعہ کا نتیجہ ہی ہے کہ لوگ اپنے گھروں پر اطمینان کی نیند سوتے ہیں۔ ابھی چند سال پہلے تک یہ عالم تھا، لیکن ادھر چند سال امن وامان کی اس مثالی شکل میں فرق آگیا ہے، کیوں کہ مشرقِ بعید کے لاکھوں کی تعداد میں جرائم پیشہ افراد بھی احرام کا لباس پہن کر چوری کے لیے آیا کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود جتنی واردات امریکہ میں ایک روز میں ہوتی ہے، سعودی عرب میں دس سال میں بھی نہیں ہوتی۔ جہاں اسلامی قوانین کا سایہ ہے، وہاں یہ حال ہے۔ شریعت نے اسی طرح نکاح اور شادی کے اصول بنا دیئے ہیں، ہر کام میں ایک حد مقرر کر دی ہے، نکاح کا اعلان ہونا چاہیے اور ولیمہ کی بھی ہدایت کی گئی ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق جیسا کھانا کھلا سکتے ہو اور جتنے آدمیوں کو کھلا سکتے ہو کھلاؤ، یہاں تک کہ ایک مٹی بھر کھجور کھلا دینا بھی بعض صحابہؓ سے ثابت ہے، وہ بھی فرض نہیں ہے مستحب اور مسنون ہے ، اصل نکاح کا اہم جزء اعلان ہے، جس کا اہتمام کیا جاتا ہے، مگر اس کی خاطر کوئی اپنی حیثیت کے مطابق دیتا لیتا ہے، جس کے لیے قرآن کریم میں "المعروف" کا لفظ آیا ہے جو جائز رواج کے اندر ہو، یہ بھی فرمایا گیا کہ سب سے مبارک شادی وہ ہے جس میں کم سے کم بار پڑے "اَقَلُّهَا مُؤْنَةً" کا لفظ آیا ہے، یعنی کم سے کم بوجھ جس پر پڑے وہ مبارک ہے، مگر درمیانی طبقہ کی سفید پوشی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ سفید پوشی تو ہو گئی، مگر سرپوشی نہ ہو سکی، یعنی اس کی مالی حیثیت کھل جاتی ہے جب قرض کا بار بڑھتا ہے اور کبھی قرض کی نوبت آجاتی ہے۔ قرض لے کر، مدد لے کر، دکھاوے اور نمائش کی تقریب نے اس طبقہ کو تباہ کر کے رکھا ہے، جو اپنے سے بلند طبقہ کی نقل کرتا ہے اور اپنے برابر کے اقتصادی حدود میں رہنے والوں سے اپنے آپ کو اونچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ لوگ اس طرح صاحبِ حیثیت اور صاحبِ وجاہت سمجھیں گے، حالانکہ نتیجہ برعکس ہوتا ہے، کھانے والے اور دھوم دھام کی تقریب میں شریک ہونے والے اندھے تو نہیں ہوتے، وہ اپنے پرائے کی حیثیت سے واقف ہوتے ہیں، جانتے ہیں کہ یہ سب نمائش یا تو قرض پر ہو رہی ہے یا مدد پر، دولت کسی سے ہاتھ لگ گئی ہے جو اپنی بیٹی کی شادی میں اتنا خرچ کر رہا ہے، دھوم دھام سے اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کرنے والے ہر حال میں خسارہ میں رہتے ہیں، جو کھاتے ہیں وہ بھی اس کی مذمت کرتے ہیں اور ملت کے دردمند

افسوس اور حسرت سے یہ مناظر دیکھتے ہیں۔

جہیز میں اکثر و بیشتر ایسی چیزیں بھی دی جاتی ہیں کہ جن کا زندگی بھر کوئی کام نہیں ہوتا، اگر قیمتی ہوتا ہے تو اس کو محفوظ رکھتے ہیں کہ بوقتِ ضرورت کام آئے گا اور وہ ضرورت آتی نہیں، مثلاً چھوٹا سا گھر ہے اور قد آدم خوشنما آئینہ کسی نے تحفہ میں دیا، اب غریب دولہا کے فلیٹ میں نہ اس کی گنجائش ہے اور نہ دوسرے ساز و سامان سے وہ میل کھاتا ہے، غرض شریعت سے انحراف کی صورت میں خسر الدنیا والآخرۃ کا منظر سامنے آتا ہے۔

اب مسئلہ طلاق کو لیجئے! یوروپ اور افریقہ میں تو ایک عورت کی حیثیت اس گندے اور میلے تولیہ کی ہے جو کسی تھرڈ کلاس کی ریسٹورنٹ میں واش بیسن کے ساتھ لٹکا دیا جاتا ہے، ہر کھانے والا اپنے ہاتھ پونچھتا ہے، اسی طرح سفید چمڑی والی یورپین اور سیاہ چمڑے والے افریقین جب چاہتے ہیں ذرا سی بات پر طلاق دے کر کورٹ میں رجسٹری کرا لیتے ہیں اور پھر دونوں آزاد ہیں اور بار بار، یہاں تک کہ ستر سال کی عمر والے اور عمر والیاں مطلاق و مزواج (طلاق لینے والیاں اور نئے نکاح کرنے والیاں) ہوتی ہیں، اولاد کی زندگی پر یہ اثر پڑتا ہے کہ اس کا تشخص مشتبہ ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج یوروپ کے شہروں میں نہ تو عدت کی ضرورت اور نہ انتظار کی، دوسری شادیاں اکثر طلاق کے دن ہی ہو جاتی ہیں، اس سے موروثی و غیر موروثی بیماریاں پھیلتی ہیں، بچے ماں کی ممتا سے محروم اور مائیں اولاد کی سعادت مندیوں سے ناواقف، ایسے ماحول کے پروردہ بچے جو اپنے والدین کو ایک دوسرے سے جدا دیکھتے ہیں، ان کا دماغ مجرمانہ ہو جاتا ہے، وہ ذرا سی خواہش کے لیے ہر قسم کے جرائم کر سکتے ہیں اور نہ مل سکے تو خودکشی پر آمادہ رہتے ہیں، بلیو فلمیں، حسین رسائل، برہنہ تصویروں والے میگزین، نوعمر اور نوخیز بچے عشق بازی کی مشق کرتے ہیں اور فلم کے ہیرو کی طرح خودکشی بھی کرتے ہیں، وہاں تو خودکشی کا پارٹ ہوتا ہے، یہاں مشرق میں اس طرح کی خودکشی حقیقی ہوا کرتی ہے۔

قرآن کریم کی آیت جو میں نے شروع تقریر میں پڑھی ہے، خُلِقَ الاِنْسَانُ عَجُوْلاً، وہ جلد بازی چاہتا ہے کہ ایک شب کے اندر جن کی طرح مکان بنالے، اعلیٰ ملازمت مل جائے، امتحان کی تیاری کے بغیر امتحان میں بیٹھے اور فرسٹ کلاس پوزیشن کر کے نکلے اور جب یہ نہیں ہوتا تو وہ لَیَئُوْسٌ کَفُوْرٌ انتہائی مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے۔

اسلام جو حقیقت پسند دین ہے اور انسان کے خالق کا بتایا ہوا دین ہے، وہ اپنی مخلوق کی نفسیاتی کشاکش سے واقف ہے اور انسانی زندگی کے اونچ نیچ کو جانتا ہے، اس نے طلاق و خلع کو ایک خاص

قانون کے اندر کنٹرول میں رکھا ہے۔ شاہ صاحب (حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ) نے تنظیم القرآن کے عنوان سے لکھا ہے: اس سے بہتر مستحکم مبنی بر عدل نظام کسی شریعت میں نازل نہیں ہوا۔

اب آپ دیکھیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین، زندگی کا پیغام دینے اور آپ کی شریعت زندگی بخش کن معنوں میں ہے۔

خانگی زندگی سے معاشرتی زندگی تک، گھر سے لے کر بازار تک، شہر سے لے کر بیرونِ ملک تک، پیشہ اور ہر فن میں جہاں مکمل حقوق کی حفاظت ہے۔ یہی مفہوم ہے حضرت ربعی بن عامرؓ کا یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو مذاہب کی تنگ نائیوں سے نکال کر اسلام کے وسیع دامن میں جگہ دی، کفر وانار کی اور ظلم کی تاریکیوں سے نکال کر اسلام کی روشن شاہراہ پر کھڑا کیا۔

ایک امر واقعہ ہے جس کی شہادت زمانہ خود دے رہا ہے اور دیتا رہا ہے، اگر انسانیت کو جائے پناہ مل سکتی ہے اور مظلوموں کو ان کا حق، کمزوروں کو انصاف اگر کوئی دے سکتا ہے تو صرف اسلام ہے۔

☆☆☆

سلام اس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا

محمد رضوان القاسمی

آیئے اقبالؒ کے "دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل" کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے ماہرؔ سے مستعار لے کر بصد آداب سلام پیش کریں ۔

سلام اس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا

واقعہ ہے کہ مہد سے لے کر لحد تک یا دوسرے لفظوں میں گود سے لے کر گور تک کی جو درمیانی زندگی ہے، ان سب کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سمجھایا، جس انداز سے سمجھایا اور کسی نے نہیں سمجھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھائے ہوئے کو کوئی سمجھ لے تو سمجھئے کہ اس کی زندگی میں بہار آئی، نکھار آیا، قرار آیا۔

انسان کی زندگی کی مختلف کیفیات ہیں، دائرے ہیں، زاویئے ہیں۔ ان کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہمیں آگے بڑھنا ہے اور اختصار کے ساتھ مجموعی طور پر دیکھنا ہے کہ زندگی کے راز کو کس کس طرح سمجھایا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے دیکھئے اس بچہ کی طرف، ماں کے پیٹ سے ابھی ابھی اس نے مادرِ گیتی میں قدم رکھا ہے، زندگی کا راز سمجھانے والے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ اسے کسی رنگ میں رنگنے کی ضرورت نہیں ہے، (جیسا کہ نصاریٰ کے یہاں رسم رہی ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد ساتویں دن ایک خاص قسم کے رنگین پانی میں نہلا کر یہ سمجھتے تھے کہ بچہ نصرانی بن گیا۔ اس رسم کو "بپتسمہ" کہتے ہیں) اسے بس اللہ کے رنگ میں رنگ دو، ایمان کی حقیقت اندر اتار دو، یہ رنگ نہایت پکا ہے، اس کی ظاہری صورت یہ ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کے کلمات کہو، کوئی اچھا نام رکھ دو، ایسا نام جس سے اللہ کی بندگی ظاہر ہوتی ہے تو وہ بہت بہتر ہے، (جیسے عبداللہ، عبدالرحمٰن، لڑکوں کے لیے اور امتہ اللہ، امتہ الرحمٰن وغیرہ لڑکیوں کے لیے)

عقیقہ بھی کر دو، اس سے بچہ عام آفات وبلیات سے محفوظ رہے گا، ختنہ کی سنت پر بھی عمل ہونا چاہیے، اس میں متعدد حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں، بچہ کچھ بولنے لگے تو سب سے پہلے اللہ کا نام اور کلمہ (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) سکھاؤ، سورۃ الفرقان کی دوسری آیت بھی یاد کرادو، اس میں توحید کی پوری تعلیم کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹ دیا گیا ہے۔

مکتب کی تعلیم کا وقت آئے تو بنیادی طور پر تین طرح کی تعلیم سے غفلت نہیں برتنا چاہیے، ایسی تعلیم جس سے اس کے دل میں اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت پیدا ہو، دوسرے نمبر پر نبیؐ کے آل، صحابہؓ اور صالحین کی عظمت اور ان کی دینی خدمت کا تاریخی حیثیت سے تعارف ہو اور تیسرے نمبر پر وسیع تر معنی و مفہوم میں قرآن کی تعلیم، شروع ہی سے تعلیم کے ساتھ تربیت پر نگاہ ہو، لیکن بچہ جب سات سال کی عمر کو پہنچے تو اس فکر واہتمام میں کافی اضافہ ہونا چاہیے، تعلیم و تربیت کے اعتبار سے بچہ کی ابتدائی عمر نہایت اہم ہوتی ہے، اس سے بے توجہی، اس کے لیے "بربادی" مول لینا ہے۔

زندگی کا راز سمجھانے والے نبیؐ نے تعلیم کی ہر طرح حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ اس سلسلہ میں چند کلیوں پر قناعت محمود اور محبوب نہیں ہے، یہاں تو "بڑھے چلو" کی صدائے دل نواز ملتی ہے، دور دراز سفر کے لیے بھی کمربستہ ہونا چاہیے، "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے" کا حوصلہ ملتا ہے، ثریا پر کمند ڈالنے کی تلقین کی گئی، اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھول کر ہر طرح کے علم وفن میں کمال درجہ حاصل کیا جاسکتا ہے، البتہ ہر مسلم آبادی میں کچھ لوگ (علماء) ضرور ایسے رہیں، جو قرآن وحدیث اور دین وشریعت کا تحقیقی اور تفصیلی علم رکھتے ہوں، تاکہ معروف ومنکر، حلال وحرام، جائز و ناجائز، خدا کی مرضی اور نامرضی کی تعلیم بصیرت اور یکسوئی کے ساتھ جاری رہے، دعوتی نقطۂ نظر سے مختلف زبانوں مہارت بھی حاصل کی جائے۔

انسانی زندگی میں تعلیم کے ساتھ معاشی استحکام بھی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں زندگی کا راز سمجھانے والی نبیؐ کی جو ہدایات ملتی ہیں، ان سے واضح ہے کہ مفت خوری کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے، سوال کی ذلت اٹھانے سے بچنا چاہیے، کسبِ معاش کے لیے کسی بھی جائز پیشہ کو معیوب نہیں سمجھنا چاہیے، معاشی سرگرمی بھی راہِ خدا میں جد وجہد کا ایک حصہ ہے، ناجائز اور باطل طریقہ سے اجتناب کرنا چاہیے، فقر وافلاس بسا اوقات انسان کو کفر تک لے جاتا ہے، اس لیے اپنی معاشی موقف کو بہتر طریقہ پر مضبوط رکھنا چاہیے۔

لڑکا ہو یا لڑکی، مناسب جوڑا مل جانے کے بعد شادی میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے، شادی،

سادی ہو اور سنت کے مطابق، آپؐ کے فرمان کے بموجب "سب سے باعظمت اور بابرکت نکاح وہ ہے جس میں کم سے کم خرچ ہو"، میاں بیوی باہمی طور پر عفو و درگذر سے کام لیں، ایک دوسرے کے جذبات، احساسات اور نفسیات کا خیال رکھیں، اس سے ازدواجی زندگی خوش گوار گزرے گی، خاندانی روابط میں بہتری ہو، جو ٹوٹے اس سے جڑنا چاہیے، فرقِ مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے ہر رشتہ دار سے اچھا سلوک کرنا چاہیے، ماں کے قدموں کے نیچے (یعنی ان کی خدمت واطاعت میں) جنت ہے، باپ جنت کا دروزاہ ہے، اولاد کے حقوق کو جاننا چاہیے، پڑوسی کا حق پہچاننا ایمان کی علامت ہے، جو شخص خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہ جائے، وہ مؤمن نہیں ہو سکتا، جس کی اذیت اور بدی سے پڑوسی محفوظ نہیں رہے وہ بھی صاحبِ ایمان نہیں، ایمانی تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ مہمان کا اکرام کیا جائے، استاذ کا احترام ضروری ہے، اس سے علم کے دروازے کھلتے ہیں اور توفیق ارزانی بارگاہِ الٰہی سے نصب ہوتی ہے، خاندانی اور سماجی زندگی میں عورت کی حیثیت جو بھی ہو، ہر حیثیت کے اعتبار سے اس کے مرتبہ کو بلند و بالا کیا، ترکہ اور میراث میں اسے حصہ دلایا، عمومی حیثیت سے میراث کا متوازن، عادلانہ اور معقول نظام جاری فرمایا۔

سب سے زیادہ کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور جو اپنے گھر والوں کے ساتھ حسن سلوک میں سب سے بڑھا ہوا ہے، اپنے آپ کو اس بت کا خوگر بنانا چاہیے کہ لوگ اگر اچھا سلوک کریں گے جب بھی میں اچھا سلوک کروں گا اور اگر وہ برا سلوک کریں گے تو بھی میں ان پر ظلم نہیں کروں گا، کسی سے دوستی اور دشمنی خدا کے لیے ہو، جو شخص کسی ظالم کو ظالم جانتے ہوئے اس کا ساتھ دیتا ہے، وہ گویا اسلام سے نکل جاتا ہے، غیبت، ٹوہ میں پڑنا، افواہ طرازی، الزام تراشی، مذاق اڑانا، یہ سب چیزیں باہمی تعلقات کی دیوار میں شگاف پیدا کرتی ہیں، اس شخص میں ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں اور وہ شخص بے دین ہے جو عہد کا پابند نہیں، حیا بھی ایمان ہی کا ایک شعبہ ہے، مؤمن کبھی طعنہ دینے والا، لعنت کرنے والا، بدگو اور زبان دراز نہیں ہوتا، وہ اپنی زبان اور ہاتھ کے شر سے دوسروں کو محفوظ رکھتا ہے، راستہ کو خراب کرنا اور وہاں تکلیف دہ چیزوں کو ڈالنے کا کیا ذکر، وہ ایسی چیزوں کو راستے ہٹاتا ہے، چغل خوری کی خو نہیں ہوتی ہے، کینہ سے سینہ پاک رکھتا ہے، مؤمن کھجور کے درخت کی طرح ہے، اپنے پورے وجود سے دوسروں کے لیے نفع بخش ہوتا ہے، مؤمن وہ ہے جس سے لوگوں کو اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کے بارے میں کوئی خطرہ نہ ہو، مؤمن مصیبت میں صبر اور نعمت پر شکر ادا کرتا ہے، عسر ہو یا یسر، تنگی ہو یا فراخی، ہر حالت میں وہ

مطمئن رہتا ہے اور اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط رکھتا ہے، ملنے پر اکڑتا نہیں ہے اور نہیں ملنے پر مایوس نہیں ہوتا، خود بینی اور بدبینی سے احتراز کرتا ہے، آپس کے معاملہ میں سخت گیر نہیں ہوتا، وہ عفو و درگذر سے کام لیتا ہے، صلح کو جنگ پر ترجیح دیتا ہے، مصالحت اور مفاہمت میں سکون کے راز کو پاتا ہے، وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اتفاق و اتحاد کی اصل اور جڑ "تواضع" ہے، جھکاؤ میں کام کا بناؤ ہے اور رشوت میں کام کا بگاڑ، سادگی انسان کی اہم اور معیاری صفت ہے، تصنع اور بناوٹ سے حقیقت کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے اور آدمی کی شخصیت عیب دار بن جاتی ہے۔

بہترین آدمی وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے، انسان کی بھوک، پیاس اور علاج کی ضرورتوں کی تکمیل کا مطلب خدا کو پانا ہے، کسی کی حاجت روائی کی گئی تو اللہ اس کے حاجت روا بن جاتے ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، کسی کی چھوٹی سی مصیبت کم کرنے کے معنی ہیں دنیا اور آخرت کی اپنی بڑی مصیبتوں کو اللہ تعالیٰ سے کم کرانا، بیواؤں کی خبر گیری، یتیموں کی سرپرستی، غریبوں کی مدد، معاشی رہبری، اقتصادی رہنمائی، معاشی کفالت، یہ تمام نیک کام ہیں، جن کے باعث اللہ تعالیٰ اپنی رضا کا پروانہ عطا فرماتے ہیں، معاملہ کو ہمیشہ صاف رکھنا چاہیے، اس میں دھوکہ بازی سے اللہ کی نصرت روٹھ جاتی ہے، مالی بددیانتی سے خدا کی رحمت منہ موڑ لیتی ہے، سود و رشوت، چوری ڈکیتی، فریب دہی کے پیسے ناجائز اور حرام ہیں، بدکاری، شراب نوشی اور نشہ آور چیزوں کے استعمال سے قطعاً احتراز کیا جائے، ان لعنتوں میں پڑنے سے دولت ضائع ہوتی ہے، صحت برباد ہوتی ہے، روحانی دنیا اجڑ جاتی ہے، دوزخ اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ گھات میں لگ جاتی ہے۔

زندگی کا راز سمجھانے والے آخری نبیؐ نے یہ بھی سمجھایا ہے کہ طہارت و نفاست اور جسم و لباس کی پاکیزگی نصف ایمان ہے، مؤمن وہ ہے جس کا گھر، آنگن، صحن، اردگرد سب صاف ستھرا رہتا ہے۔ ماحولیات کو بہتر بنانے کے لیے آج سو جتن کیے جارہے ہیں، مگر حیات کے راز کو پانے والے نبیؐ نے بہت پہلے ماحولیات کو بہتر بنانے کے مختلف انداز سے جو تعلیمات دی ہیں، وہ بے نظیر ہیں اور کسی بھی ریسرچ اسکالر کی ریسرچ کے لیے اہم موضوع آپ کی ایک حدیث سے واضح ہے کہ ہر مرض کا علاج ہے اور ہر بیماری کی دوا خالق کائنات نے پیدا فرمائی ہے، تلاش و جستجو سے اس کا سراغ لگانا، یہ ہر دور کے انسان کا کام ہے، طب نبویؐ تو ایک مستقل عنوان ہے، جس میں علاج و معالجہ کے فن کے لیے ان گنت نظری اور عملی سامان ہے۔ آپ کی متعدد ہدایت سے معلوم ہوتا ہے کہ علم و تحقیق کے سرچشمے جاری رہنے چاہئیں، ان کے سوتے خشک نہ ہونے پائیں، زراعت، تجارت، باغبانی، آب رسانی، ذرائع

ابلاغ میں حقیقت بیانی اور صداقت شعاری، روشنی، سواری، حیوانوں کی افزائش نس، تعمیرات، صنعت و حرفت، ٹکنالوجی، (بوقتِ ضرورت) حربی اور جنگی تکنک، سائنٹیفک اندازِ فکر، بلدیاتی نظام، ان میں سے کون ایسی چیز ہے جس کے بارے میں کہیں اشارتاً اور کہیں وضاحتاً آپؐ نے نہ فرمایا ہو۔ ان میں سے ہر موضوع پر نبوی تعلیمات کا مطالعہ، مطالعہ نگار کے لیے سرمہ بصارت و بصیرت ہے۔ آپؐ کے فرمان سے ظاہر ہے کہ شاعری اپنی تاثیر میں جادو سے کچھ کم نہیں ہے، بعض اشعار حکمت و دانائی سے لبریز ہوتے ہیں، البتہ ادب اور شاعری کے ظرف کو ملحدانہ اور غیر حقیقت پسندانہ خیالات سے خراب نہیں کرنا چاہیے، واعظ اور مقرر کو حد درجہ ذمہ دار اور حقیقت شعار ہونا چاہیے۔ غیر ذمہ دار اور فتنہ پرداز واعظ اور مقرر کے بارے میں آپ کا بیان ہے کہ قیامت کے دن اس کی زبان اور ہونٹ قینچیوں سے سے کترے جائیں گے۔

عبادت کے ذوق و شوق سے اپنی روح کو توانا کرنا اور آخرت کو بنانا چاہیے، مالک اور ملازم، آقا اور حاکم، ایک دوسرے کے حقوق پورے طور پر ادا کرتے رہیں، تاکہ ایک طرف سے شکایت اور دوسری طرف سے اسٹرائک کا موقع نہ آئے، تقویٰ اور پرہیز گاری فضیلت کا معیار ہے، نہ کہ حسب نسب اور قبیلہ خاندان، وطنی، علاقائی، لسانی، لونی، نسلی، عصبیتیں ملک اور سماج میں تباہی اور بربادی لاتی ہیں، اخوت اور مساوات کے درس کو عام کرنا چاہیے، ہر موقع اور ہر کام کے لیے آداب بتادیئے گئے ہیں، جن کی رعایت سے کام میں برکت، سہولت اور زینت آتی ہے، صبح و شام اور روز و شب کے لیے دعائیں ہیں، جن کے اہتمام سے خدا سے تعلق مستحکم ہوتا ہے اور اعمال میں نورانیت آتی ہے، رات میں جلد سونا چاہیے، تاکہ صبح سویرے بیدار ہو کر خدا کے دربار میں سورج نکلنے سے پہلے حاضری دے کر دن کے کام کا آغاز کرسکے، رات کو لغویات اور دن میں فضولیات میں مشغول ہونا، اپنی زندگی کی قسمت کو سلانا اور خدا کی بارگاہ میں اسے معتوب بنانا ہے، عمر کی کوئی بھی منزل ہو، اسے ذمہ دارانہ اور حوصلہ مندانہ گزارنا چاہیے، عقلمند شخص کے شب و روز کی تقسیم زندگی کارازپانے والے نبی نے اس طرح کی ہے کہ (۱) وہ خدا سے باتیں کرے (عبادت و اطاعت کے ذریعہ) (۲) اپنی ذات کا محاسبہ کرے (۳) خدا کی تخلیق میں غور کرے (۴) کھانے پینے کی ضرورتوں کے لیے وقت نکالے، آپؐ کے فرمان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وقت نہایت قیمتی ہے، اس کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

زندگی کارازپانے اور سمجھانے والی نبیؐ کا بیان ہے، کہ "میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے: (۱) کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہوں، (۲) غصہ میں ہوں یا خوشی میں، ہمیشہ

انصاف کی بات کہوں، (۳) محتاجی اور امیری دونوں حالتوں میں اعتدال پر قائم رہوں (۴) جو مجھ سے کٹے، میں اس سے جڑوں، (۵) جو مجھے محروم کرے، میں اسے دوں، (۶) جو مجھ پر ظلم کرے، میں اس کو معاف کردوں، (۷) میری خاموشی غور فکر کی خاموشی ہو، (۸) میرا بولنا یادِ الٰہی کا بولنا ہو، (۹) میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو۔

ایک مرتبہ آپؐ کے چچازاد بھائی، داماد اور خلیفہ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے آپؐ سے سوال کیا کہ آپؐ کی زندگی کیسی ہے؟ تو جواب میں ارشاد فرمایا: "(۱) معرفت میرا راس المال (اصل پونجی) ہے، (۲) عقل میرے دین کی جڑ ہے، (۳) محبت میری بنیاد ہے، (۴) شوق میری سواری ہے، (۵) ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے، (۶) اعتماد میرا خزانہ ہے، (۷) حزن اور اندوہِ دل میرا رفیق ہے، (۸) علم میرا اہتھیار ہے، (۹) صبر میرا لباس ہے، (۱۰) رضا میری غنیمت ہے، (۱۱) عجز میرا فخر ہے، (۱۲) زہد میرا حرفہ ہے، (۱۳) یقین میری خوراک ہے (۱۴) صدق میرا ساتھی ہے، (۱۵) اطاعت میری عزت اور بچاؤ ہے، (۱۶) جہاد میری خصلت ہے (۱۷) اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔"

آخر میں زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف آیئے، جس پر یقین، صلاح و فلاح کی ضمانت دیتا ہے، شخصی اور اجتماعی زندگی کو کامیاب بناتا ہے، سماج اور معاشرہ سے ہر طرح کی سماجی اور معاشرتی بیماری کو دور کرتا ہے۔ وہ ہے آخرت کی زندگی کا تصور۔ آپؐ نے اپنی ابتدائی دعوتی زندگی میں صفا نامی پہاڑی سے خدا کی عظمت بیان کرنے کے بعد خدا کے بندوں کے نام یہ پیغام نشر فرمایا تھا:

"خدا کی قسم تمہیں مرنا ہے، جس طرح تم سوتے ہو اور پھر تم کو اٹھنا ہے، جس طرح تم جاگتے ہو اور ضرور تم سے حساب لیا جائے گا اور پھر اچھے کام کا اچھا بدلہ اور برے کام کا برا بدلہ اور اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لیے باغ ہے یا ہمیشہ کے لیے آگ ہے۔"

زندگی کا راز بتانے اور سمجھانے والے نبیؐ کے دربار میں جب ہم آپ حاضر ہوئے تھے، تو ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلام کیا تھا، اب آپؐ کی مجلس سے اٹھ رہے ہیں، اٹھنے کو دل تو نہیں چاہتا تھا، مگر دل ہی جانتا ہے کہ کس طرح سے اٹھ رہے ہیں، آیئے رخصت ہوتے ہوئے دوبارہ ماہر ہی سے ان کا سلام مستعار لے کر نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ یہ عرض کریں کہ ؎

سلام اس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا

ذہن و دماغ میں آپؐ کی اس بافیض اور مبارک مجلس کی خوشبو بسائے ہوئے اپنی قیام گاہ کی طرف واپس ہو رہے تھے کہ راستہ میں دیکھا کہ آپؐ پر ہمیشہ جان و دل فدا کرنے والے نواب بہادر

یار جنگ ایک جلسۂ سیرت النبی کو اپنی شانِ امتیازی کے ساتھ مخاطب کر رہے ہیں۔ دورانِ تقریر جب انہوں نے عقیدت و محبت سے سرشار اپنا یہ شعر سنایا تو کان کی راہ سے دل کی گہرائی میں اترتا چلا گیا، پھر دل اور زبان کا رابطہ بڑھا اور زبان، قیام گاہ کی واپسی تک اس شعر کو دہرانے لگی۔ لذت تھی جو ختم نہیں ہو رہی تھی، لطف تھا جو ہر بار دوبالا ہو رہا تھا ۔

اے کہ تو فخرِ آدمی ، واقف سر عالمی
لوح و قلم سے بے نیاز، تیرے علوم شش جہات

☆☆☆

سیرتِ رسولؐ
اور ہمارا ایک اہم فریضہ

مولانا بدر الحسن قاسمی

زندہ در گور مصنف سلمان رشدی نے اپنی کتاب "The Satanic Verses" سے مالی منفعت جو بھی حاصل کی ہو، لیکن ہمہ وقت مسلط رہنے والے خوف اور نفسیاتی کرب نے آخرت کے محاسبہ سے پہلے ہی اسے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے، کہ اس کے لیے زندگی بے لطف بن کر رہ گئی ہے اور موت کے سایہ نے اس کے خوابوں کے سارے محل اس طرح چکنا چور کر دیئے ہیں کہ اس پر قرآنِ کریم کی یہ آیت صادق آنے لگی ہے:

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (سورہ: حم سجدہ)

اور یقیناً ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے قریب کا عذاب بھی چکھائیں گے، تاکہ وہ (اپنی کج روی سے) باز آ سکیں۔

یا پھر قرآن کی یہ آیت جو ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جس نے خواہش نفس کی تکمیل کے لیے خدا کی نشانیوں سے روگردانی کی تھی:

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ (الاعراف: ۱۷۶)

پس اس کی مثال اس کتے کی ہے جس پر اگر تم بوجھ ڈالو تب بھی ہانپتا ہے اور اگر بوجھ نہ ڈالو تب بھی ہانپتا ہے۔ یہ مثال ہے اس قوم کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، لہٰذا آپ ان کو یہ قصے سنا دیں، تاکہ وہ غور و فکر کر سکیں۔

ایک سلمان رشدی پر ہی کیا منحصر، دنیا میں ایسے بد بختوں کی کمی نہیں ہے جو ذرا وزن کی

ہوس میں اپنا دین وایمان فروخت کر بیٹھتے یا اپنی نام نہاد آزاد خیالی اور ترقی پسندی کا بھرم رکھنے کے لیے خدا اور رسول کی شان میں گستاخیاں کرنے لگتے ہیں۔ عرب دنیا میں اس وقت لبنانی شاعر اڈونیس کا شمار بھی انہیں لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے براہِ راست خود ذاتِ باری کے بارے میں ہرزہ سرائی کی ہے اور خدا کو شیطان کے ہم پلہ قرار دینے کی گستاخانہ جرأت کی ہے۔

ظاہر ہے کہ سورج پر تھوکنے کی کوشش خود اپنی عقل کے دیوالیہ ہونے کا اعلان ہے: چنانچہ نہ تو گستاخانہ کلمات لکھنے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے داغ سیرت پر کوئی حرف آیا اور نہ ہرزہ سرائی سے ذاتِ باری کی عظمت میں کمی ہوئی؛ البتہ دریدہ ذہنی کرنے والوں نے اپنے آپ کو دنیا کے سامنے ننگا ضرور کر لیا اور اپنی طبیعت کی خست پر ضرور مہر تصدیق ثبت کر لی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت شفاف آئینہ کی طرح بے داغ رہی ہے، جس کی شہادت آپؐ پر ایمان لانے والوں ہی نہیں، آپؐ سے بغض وعداوت رکھنے والوں نے بھی دی ہے: چنانچہ ایسے غیر مسلموں کی فہرست خاصی طویل ہے جن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک نے اپنا گرویدہ بنایا اور وہ اس اقرار واعتراف پر مجبور ہوئے کہ پوری انسانی تاریخ میں آپؐ اپنی مثال آپؐ ہی تھے، کوئی دوسرا آپؐ کا اس خصوصیت میں شریک وثانی نہیں گذرا، نہ صرف یہ بلکہ آپؐ کی لائی ہوئی تعلیمات اور آپؐ پر نازل شدہ دین کی حقانیت اور صداقت کا بھی انہوں نے برملا اقرار کیا اور آپؐ کی بڑائی اور عظمت کے گیت گائے۔

ہم چند ایسی شہادتیں پیش کرتے ہیں جو ان لوگوں کی ہیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے دوست نہیں، دشمن تھے، اپنے نہیں، بیگانے تھے۔

مشہور جرمن شاعر "گوئٹے" اسلام کی تعلیمات پر تفصیل سے نظر ڈالنے کے بعد لکھتا ہے:

> "اگر اسلام یہی ہے تو ہم سب کے سب مسلمان ہیں، ہر وہ شخص جو حسن اخلاق اور شرافت کا پیکر ہو وہ مسلمان کہلانے کا مستحق ہے۔"

مزید لکھتا ہے:

> "بیشک محمدؐ کا لایا ہوا دین سر تا سر اخلاص، تربیت، انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور سوسائٹی کے لیے اعلیٰ ترین اخلاقی ہدایات ہیں اور اس لحاظ سے محمد کا لایا ہوا دین تمام دوسرے ادیان ومذاہب پر فوقیت رکھتا ہے۔"

اسی طرح فرانسیسی شاعر "مارٹین" اپنی کتاب "مشرق کا سفر" میں لکھتا ہے:

"محمدؐ نے جس طرح پیچیدہ مسئلہ کو حل کیا ہے اور روحانی اقدار کے جو اعلیٰ اصول عربوں کو دیئے ہیں وہ ان سب سے بہتر ہے جو اب تک خالقِ کائنات نے دوسرے نبیوں کے ذریعہ دنیا میں بھیجے تھے۔"

فرانسیسی مستشرق گستاؤلیبان لکھتا ہے:

"دین اسلام کی بنیاد بڑی سادگی اور فطرت سے ہم آہنگی پر ہے، اسلام توحید کی تعلیم دیتا ہے اور جدید علمی نظریات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسلام کی تعلیمات سے متصادم ہو۔"

ایک دوسرا جرمن مستشرق " فویڈریک ڈیٹرچ "لکھتا ہے:

"سائنس، ریاضیات، فلسفہ اور اناٹومی کو یورپ نے جو دسویں صدی میں ترقی دی ہے، وہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قرآن سے ماخوذ ہیں۔"

فرانسیسی مستشرق "جان لاپوم" نے بڑی محنت سے قرآن کی موضوع وار فہرست تیار کی ہے، جو عام طور پر آج بھی دستیاب ہے، وہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ محمدؐ کی ولادت کے بعد سارا عالم نور سے جگمگا اٹھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انسانیت کو نئی تخلیق نصیب ہوئی ہے، ہر طرف اچھے اخلاق اور اعلیٰ اقدار کا فروغ ہونے لگا۔"

امریکی مستشرق "گبن" لکھتا ہے:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہر طرح کے عقلی شک وشبہ سے پاک ہے اور قرآن خدا کی وحدانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح بت پرستی اور کواکب پرستی کا رواج ختم کیا ہے، اس کے بعد ہمیں اس کا اعتراف کرلینا چاہیے کہ اسلام ہماری عقلوں سے ماوراایک زندہ حقیقت ہے اور جن لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ درحقیقت عصبیت اور ناعقلی کا شکار رہے ہیں۔"

انگریز ادیب "ٹامس کرلائل" نے تو بڑی ہی تفصیل سے آپؐ کے کمالات اور معجزات کا اعتراف کیا ہے اور اس بات کی شہادت دی ہے کہ حضور ﷺ ایک برحق نبیؐ تھے۔ اس نے لکھا ہے:

"یہ بات انتہائی شرم اور عار کی ہے کہ کوئی کہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ناحق ہے اور آپؐ نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ آپؐ سچے رسول تھے، آپؐ کی ساری زندگی اور آپؐ کے تمام تر کارنامے اس پر گواہ ہیں، آپؐ کے ذریعہ خدا نے عربوں کو تاریکی سے روشنی میں نکالا اور اسلام کی بدولت وہ عرب جنہیں کوئی جانتا نہیں تھا ساری دنیا میں چھاگئے اور تہذیب و تمدن کی ایسی بنیاد ڈالی جس کی نظیر نہیں ملتی۔"

فرانسیسی ادیب "فولیڈ" لکھتا ہے کہ:

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں کچھ عجیب طرح کی خوبیاں تھیں، آپؐ تکلیفیں جھیل کر لوگوں کو بھلائی کی دعوت دیتے تھے اور کوئی بچہ بھی سرراہ مل جاتا تو اس سے پیار و محبت کی باتیں کیا کرتے تھے، آپؐ کے اخلاق کے سامنے وہ ساری تنقیدیں بے معنی ہیں جو لوگوں نے مخالفت کے جذبے کی ہیں۔"

یہ چند شہادتیں ہیں جو محض نمونہ کے طور پر ذکر کر دی گئی ہیں، ورنہ اس طرح کے اگر تمام اعترافات رکھے جائیں تو پوری ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

لیکن اس واقعہ کے ساتھ ہمیں اس بات کا بھی اقرار کرنا چاہیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی تدوین، قرآن کریم کی آیات کی تفسیر اسی طرح احادیث کے ذخائر کو جمع کرنے کی کوشش کے دوران جو بعض بے سروپا حکایتیں اور قصے ہماری پرانی کتابوں میں نقل ہو گئے ہیں، اس نے دشمنانِ اسلام کے لیے فتنہ انگیزی کا بڑا دروازہ کھول دیا ہے۔

مثال کے طور پر رشدی ہی کے معاملہ کو لے لیجئے کہ اس نے جس افسانہ کو بنیاد بنا کر ناروا باتیں لکھی ہیں، وہ ایک ایسا افسانہ ہے جس کو متعدد مستشرقین نے ایک حقیقت کے طور پر لکھا ہے: چنانچہ فرانسیسی مستشرق "مرسیا الیاڈ" نے دنیا کے مذاہب و ادیان کی تاریخ پر تین جلدوں میں ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے، اس کتاب میں اس کہانی کا بھی ذکر ہے جس کو "قصہ غرانیق" کہا جاتا ہے اور جس کو بنیاد بنا کر سلمان رشدی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے بارے میں ناروا الفاظ استعمال کیے ہیں اور بدزبانی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ فرانسیسی مستشرق نے اس افسانہ کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

"ایک اہم بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت جزیرۂ عرب میں تین

بتوں کی بڑی اہمیت حاصل تھی، وہ "منات"، "لات" اور "عزیٰ" کہلاتے تھے اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں اور ان تینوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی، چنانچہ اپنی دعوت کے آغاز میں خود حضورؐ سے بھی (العیاذ باللہ) ان کے بارے میں غلطی ہوئی اور آپؐ نے ان کی عظمت کا اعتراف کرلیا، لیکن آپ کو بعد میں احساس ہو گیا، چنانچہ آپؐ نے اپنی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں تبدیلی کر دی جو سورۂ "النجم" میں موجود ہے۔"

پھر اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مؤلف لکھتا ہے کہ:

"اس کہانی کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے (محمدؐ) کا اخلاص ثابت ہوتا ہے کہ جیسے ہی ان کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ شیطان نے انہیں دھوکا دیا ہے انہوں نے خدا کی توحید مطلق کا اعلان کر دیا اور ان الفاظ میں تبدیلی کر دی اور قرآن آسمانی کتابوں میں واحد کتاب ہے جس نے نسخ کا اعتراف کیا ہے۔"

اس افسانہ کو اگر رشدی بھی اپنی کتاب میں اسی طرح جگہ دیتا تو کسی کو اس سے تعرض کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور یہ سمجھا جاتا کہ اس نے بھی بعض یورپین مؤلفین سے متاثر ہو کر اس غلط افسانہ کو صحیح مان لیا ہے، لیکن اس شخص کا جرم یہ ہے کہ اس نے سب و شتم سے کام لیا اور اپنی کتاب میں ایسے الفاظ لکھے جو کسی مہذب انسان کے قلم یا زبان سے ہرگز نہیں نکل سکتے۔

جہاں تک اصل افسانہ کا تعلق ہے، یہ سر تا سر من گھڑت افسانہ اور دشمنانِ اسلام کا پیدا کردہ ایسا فتنہ ہے جس کو ہمارے بعض سادہ لوح مؤرخین اور مفسرین نے بھی اپنی کتابوں میں جگہ دے دیا اور نادانستہ طور پر تعصب رکھنے والے عیسائی اور یہودی مصنفین کے ہاتھوں میں ایک ایسا حربہ دے دیا کہ جس کے ذریعہ آسانی کے ساتھ اسلام کی بیخ کنی کی جاسکتی ہو اور خود قرآن کے بارے میں لوگوں کو شک و شبہ میں مبتلا کیا جاسکتا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ متعدد بلند پایہ محدثین نے اس واقعہ کی نفی کی ہے اور اس افسانہ کے بارے میں صراحت کے ساتھ یہ بھی لکھی ہے کہ یہ زندیقوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہے، جس کی کوئی اصل و حقیقت نہیں ہے۔

جہاں تک قصہ کے اس جزء کا تعلق ہے کہ قرآن کی تلاوت کے دوران کیا واقعہ رونما ہوا تھا جس نے افسانہ کی بنیاد ڈال دی، تو جیسا کہ خود قرآن کا بیان ہے کہ مشرکین مکہ کی عام روش یہ تھی کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اس وقت اس طرح شور و شغب برپا کیا جائے جس سے لوگ قرآن نہ سن

سکیں، تاکہ ان کا دل قرآن کی طرف مائل نہ ہو سکے، ارشاد فرمایا گیا ہے کہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَاتَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (فصلت : ٢٦)

اور ان لوگوں نے کہا جو کافر ہیں، کہ اس قرآن کو مت سنو اور شور و شغب کرو، تاکہ تم غالب ہو جاؤ۔

اور یاقوت حمویؒ اور بعض دوسرے مؤرخین کے بیان کے مطابق کعبہ کے طواف کے دوران لات و عزیٰ کی تعریف میں اس طرح کے کلمات اپنی زبان سے ادا کیا کرتے تھے، چنانچہ جب آپؐ نے سورۂ النجم کی تلاوت فرمائی تو اس وقت کفار نے بتوں کی تعریف کے کلمات بلند آواز سے کہنے شروع کیے، جس سے دور رہنے والوں کو یہ التباس ہوا کہ خود آپؐ کے زبانِ مبارک سے وہ الفاظ نکلے ہیں، دشمنانِ اسلام تو تاک میں تھے ہی انہوں نے اس رائی سے پہاڑ بنایا اور اسے قرآن کی تفسیر کا ایک جزء بنا ڈالا۔

اس لیے ہمارا قومی اور دینی فریضہ یہ ہے کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک سے اس طرح کے گمراہ کن واقعات کی اچھی طرح چھان بین کر کے ان کی حقیقت لوگوں پر واضح کر دیں، تاکہ کسی کو تفسیر یا حدیث کی کتابوں میں اس طرح کا مواد پڑھ کر مغالطہ نہ ہو۔

☆☆☆

نبی کا اسوۂ حسنہ تجھے یہ درس دیتا ہے!

خالد سیف اللہ رحمانی

پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات طیبہ کو قرآن مجید نے "اسوۂ حسنہ"، یعنی انسانی زندگی کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے، گویا آپ ﷺ کی زندگی ایک آئینہ ہے، جس میں انسان اپنی تصویر دیکھ سکتا ہے، ایک مشعل راہ ہے، جس کی روشنی سے زندگی کی مشکل اور تیرہ و تاریک رہگذر میں روشنی حاصل کی جا سکتی ہے، انسان اپنی شخصی زندگی میں بھی اور معاشرتی و اجتماعی زندگی میں بھی آپ ﷺ کو نمونہ بنا کر دشواریوں کو آسان بنا سکتا ہے۔ سیرت کے بہت سے واقعات ہیں، جن کو ہم شب و روز سنتے اور پڑھتے ہیں، لیکن افسوس کہ ہم قصہ و کہانی کی طرح ان واقعات سے گذر جاتے ہیں، اپنی عملی زندگی میں ان سے سبق حاصل نہیں کرتے اور موجودہ احوال پر ان کو منطبق کرنے کی سعی نہیں کی جاتی، حالانکہ یہی واقعات و قصص جن کو ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں، عبرت و موعظت کے جواہر پارے اور لعل و گہر ہیں اور ان میں ہماری عملی زندگی کے لیے کتنی ہی سبق پوشیدہ ہیں اور حیاتِ مبارکہ کے چند واقعات پر موقوف نہیں، پوری سیرت ہی "کرشمہ دامن دل می کشد جا ایں جا است" کا مصداق ہے۔ اسی پس منظر میں سیرتِ نبوی کے چند واقعات پیش ہیں۔

☆☆☆

بنو زبید کے ایک صاحب مکہ آئے ہوئے تھے۔ عاص بن وائل نامی شخص سے ایک سامان خریدا اور سامان کی قیمت ادا کرنے سے مکر گئے۔ زبیدی نے ہزار ہا کوشش کی اور مکہ کی بااثر شخصیتوں سے رابطہ کیا، لیکن کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا۔ بالآخر اس شخص نے عربوں کے قدم طریقہ کے مطابق ٹھیک طلوعِ آفتاب کے وقت بوقبیس کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی فریاد بلند کی۔ اہل مکہ عام طور پر اس وقت کعبہ کے گرد و پیش بیٹھے رہتے تھے۔ اس فریاد نے لوگوں کو چونکا دیا۔ زبیر بن عبد

المطلب اٹھے اور مکہ کے شریف لوگوں کو عبد اللہ بن جدعان کے مکان میں جمع کیا اور طے کیا کہ ہم کسی شخص پر ظلم نہ ہونے دیں گے اور مظلوموں کو ان کا حق دلائیں گے؛ چنانچہ عاص بن وائل سے سامان واپس لیا گیا اور زبیدی کو اس کا سامان حوالہ کیا گیا۔ اس وقت عمر مبارک بیس سال تھی۔ آپؐ بھی اس انجمن میں ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اتفاق سے اس معاہدہ میں اشرافِ مکہ میں تین ایسے لوگ شریک تھے، جن کا نام فضل تھا؛ اسی مناسبت سے یہ تنظیم ''حلف الفضول'' کہلائی۔ نبوت کے بعد آپؐ اس کا ذکر فرماتے اور کہتے کہ آج بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے، تو میں اس کو قبول کروں گا۔(۱)

آپؐ کے اس عمل سے معلوم ہوا کہ سماج سے ظلم وجور کو دور کرنا، مظلوموں کی دادرسی کرنا اور کمزوروں کو انصاف دلانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور مؤمن کا فریضہ ہے، مسلمانوں کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ صرف اپنی حفاظت کرلیں اور سماج میں دوسرے طبقات پر جو بھی ظلم و زیادتی ہو اس پر خاموش تماشائی بنے رہیں۔ ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہاں بعض قومیں ہیں جو صدیوں نہیں بلکہ ہزاروں سال سے ظلم وناانصافی کا شکار ہیں، ان کو انسان کا درجہ نہیں دیا جاتا، وہ نسلی امتیاز اور طبقاتی نابرابری کا شکار ہیں، لیکن کیا ہم نے کبھی ان کے مسائل حل کرنے اور ظلم وجور سے ان کو نجات عطا کرنے کی کوشش کی؟ کاش ہم نے بھی اس ملک میں یہ اور اس طرح کے مظلوموں کی مدد کے لیے کوئی ''حلف الفضول'' قائم کی ہوتی!

☆☆☆

جب عمر مبارک پچیس کے قریب ہوئی تو مکہ کی ایک شریف اور سرمایہ دار خاتون حضرت خدیجہؓ نے خواہش کی کہ آپؐ ان کا مال لے کر شام جائیں اور تجارت کریں، نفع ونقصان میں دونوں کی شرکت ہو، حضرت خدیجہؓ نے اپنے غلام میسرہ کو بھی ساتھ کردیا، آپؐ نے شام کا سفر فرمایا، یہ تجارت اتنی نفع بخش ہوئی کہ سرمایہ دوگنا ہوگیا، دوسری طرف میسرہ نے آپ کی سچائی، امانت ودیانت اور پاکیزہ کردار کا بھی ذکر کیا، اس سے متاثر ہو کر حضرت خدیجہؓ نے آپ کو نکاح کا پیغام دیا، چچاؤں کے مشورہ سے آپؐ نے اس رشتہ کو قبول فرمایا اور حضرت حمزہؓ نے حضرت خدیجہؓ سے آپ کا نکاح فرمادیا۔(۲)

اس سے تجارت اور کاروبار میں امانت ودیانت کا سبق ملتا ہے۔ خیانت انسان کو وقتی فائدہ پہنچاتی ہے لیکن زیادہ نقصان اور آخرت کی پکڑ اس کے سوا ہے۔ دیانت سے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کو کم نفع حاصل ہورہا ہے، لیکن حقیقت میں اس سے آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی پائیدار اور

(۱) البدایہ والنہایہ ۲/ ۹۱-۲۹۳ (۲) البدایہ والنہایہ: ۲/ ۹۳-۲۹۴

زیادہ نفع حاصل ہوتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ عرب کی سرمایہ دار خاتون تھیں کہ رؤساءِ مکہ ان سے شادی کے خواہشمند تھے، لیکن یہ آپ کی دیانت تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو آپؐ کے قدم مبارک میں ڈال دیا اور بالآخر اپنا سب کچھ آپؐ پر نثار کردیا، نیز سب سے بڑھ کر یہ کہ مکہ کی ابتلاء و آزمائش کی زندگی میں آپ کو حضرت خدیجہؓ جیسی سمجھدار اور سراپا تسلیم وایثار شریکِ زندگی کی رفاقت حاصل رہی۔

☆☆☆

کعبہ کی عمارت نشیبی علاقہ میں تھی، جب بارش ہوتی تو چاروں طرف سے پانی اس عمارت کی جڑوں میں جمع ہوتا، اس کو وجہ سے کعبہ کی دیواریں کمزور پڑ گئی تھیں، اہل مکہ نے اس کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا، آپؐ کی عمر مبارک اس وقت بعض روایتوں کے مطابق پینتیس سال اور بعض روایتوں کے مطابق اس سے کم تھی، نبی بہر حال اس وقت نہیں ہوئے تھے، مکہ کے مختلف قبائل نے کعبہ کی مختلف حصوں کی تعمیر اپنے اپنے ذمہ لے لی، لیکن مسئلہ اس وقت الجھ گیا، جب حجر اسود کی تنصیب کا مسئلہ پیدا ہوا، یہی حصہ تھا جسے عرب سب سے زیادہ مقدس و مبارک سمجھتے تھے اور ہر قبیلہ کے لوگ چاہتے تھے کہ ان کو یہ شرف وسعادت حاصل ہو، اس اختلاف نے اتنی شدت اختیار کی کہ نوبت قتل وقتال تک آگئی، قریش کے سب سے معمر بزرگ ابوامیہ بن مغیرہ اپنے ناخن تدبیر سے اس مسئلہ کو حل کیا اور طے کیا کہ کل جو شخص سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں داخل ہو وہی اس کے بارے میں فیصلہ کرے، کل صبح سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں جن کا ورود ہوا، وہ آپ کی ذات گرامی تھی، لوگ آپ کی امانت ودیانت کی وجہ سے آپ کو ''صادق'' و''امین'' ہی کہا کرتے تھے، اہل مکہ اس سے بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے: ''ھذا الامین رضینا'' جب آپ کو اطلاع ملی کہ حجر اسود رکھنے کی بابت آپ کو فیصلہ کرنا ہے، تو آپؐ نے نہایت حسن تدبیر اور حسن تدبر سے کام لیتے ہوئے ایک چادر منگائی، چادر کے وسط میں یہ پتھر رکھا، مختلف قبائل کے ایک ایک نمائندہ کو طلب فرمایا اور فرمایا کہ چاروں طرف سے یہ سب نمائندے مل کر اس چادر کو تھام لیں، تاکہ حجر اسود کو اٹھانے میں سبھوں کی شرکت ہو جائے، یہ چادر جب اس مقام کے قریب آگئی جہاں حجر اسود کو نصب کرنا تھا، تو اپنے دستِ مبارک سے پتھر کو اپنی جگہ نصب فرمادیا۔(۱)

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر سماج میں کبھی باہم اختلاف پیدا ہو جائے تو کس طرح خوش تدبیری اور ذہانت کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیے اور ایسا رویہ اختیار کرنا چاہیے کہ جس میں مختلف طبقات کی دلداری ودلجوئی ہو اور خود ہمیں امانت وسچائی کے اس معیار پر ہونا چاہیے کہ لوگ

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۲/ ۳۰۲

ہماری دیانت اور راست گوئی میں کوئی شبہ نہ کریں۔ ہندوستان اور عالم اسلام کے موجودہ حالات میں بہت ضروری ہے کہ ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے یہی راہِ اعتدال اختیار کریں۔

☆☆☆

ابو طالب آپؐ کے چچا ہیں، محسن اور مددگار ہیں اور باوجود کفر پر ہونے کے سب سے بڑے حامی و ناصر ہیں، لیکن معاشی اعتبار سے کچھ بہتر حال نہیں، بچے بھی کئی زیر پرورش ہیں، رسول اللہ کو اس صورتِ حال کا بڑا احساس تھا، چچاؤں میں حضرت عباسؓ کی معاشی حالت غالباً سب سے بہتر تھی، دور دراز تک ان کے کاروبار کا دائرہ وسیع تھا، آپؐ نے حضرت عباسؓ سے ملاقات کی کہ ہم لوگ چچا ابو طالب کے بچوں کی کفالت و پرورش اپنے ذمے لے لیں، حضرت عباسؓ تیار ہو گئے، آپؐ پہلے سے تیار تھے، پھر ابو طالب سے درخواست کی، ابو طالب نے کہا: عقیل تو میرے پاس رہیں گے، باقی علی اور جعفر کو تم لوگ اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو، چنانچہ حضرت علیؓ کو تو آپؐ نے اپنے پاس رکھا اور حضرت جعفرؓ کو حضرت عباسؓ کے حوالہ کیا، تاکہ چچا کا بوجھ کچھ کم ہو، پھر تو حضرت علیؓ کی اولاد کی طرح پرورش کی اور بالآخر حضرت فاطمہؓ کو ان کی زوجیت میں دے دیا۔(۱)

معلوم ہوا کہ انسان کو اپنے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کی خبر گیری کرتے رہنا چاہیے، ان کے احوال سے واقف ہونا چاہیے اور ان کی طرف دستِ تعاون بڑھانا چاہیے۔ تعاون کی ایک صورت تو یہ ہے کہ محض وقتی مدد کر دی جائے، کچھ پیسے دیدیئے جائیں، ایک دو وقت کھانا کھلا دیا جائے، اس سے وقتی اور عارضی سہولت ضرور ہوتی ہے، لیکن یہ مسئلہ کا مستقل حل نہیں، مستقل حل یہ ہے کہ اگر آپ کے خاندان میں کوئی شخص غریب ہو، بچوں کی تعلیم و تربیت کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو وقتی مدد کرنے کے بجائے انسان اپنے بچوں کے علاوہ خاندان کے ایک دو بچوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لے، ان کی پرورش بھی کرے اور تعلیم و تربیت کا فریضہ بھی انجام دے۔ آپ کے اس عمل سے ایک شخص کی نہیں بلکہ پورے خاندان کی مدد ہو گی، وہی لڑکا کل ہو کر اپنے خاندان کو سنبھالے گا اور ایک پورا خاندان پسماندگی کے معیار سے اونچا ہو سکے گا۔ افسوس کہ آج کل ہمارے یہاں یہ جذبہ مفقود ہے۔ اگر ہمارے دو بچے ہوں، تو ہم خاندان کے ایک اور بچہ کی ذمہ داری لے لیں اور ہم مان کر چلیں کہ ہمارے تین بچے ہیں، تو یہ کیا ہی بہتر ہو! سماج کو اونچا اٹھانے کے لیے یہ نسخہ کیمیا سے کم نہیں۔ کاش ہندوستان کے مسلمان اس حقیقت کو سمجھیں اور آپؐ کے اس عمل کو اپنے لیے اسوہ بنائیں!

☆☆☆

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۲۴۶

جب عمر مبارک ۴۰/ سال ہوئی، ایک شب آپؐ غارِ حرا میں مقیم تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور اللہ کی طرف سے پہلا کلام (القلم /۱-۵) آپ پر اتارا، گویا نبوت کا تاج گہر بار آپؐ کے سر مبارک پر رکھ دیا گیا، لیکن نبوت کی ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں، ایک طرف اللہ سے تعلق دوسری طرف اللہ کے بندوں سے، اللہ سے ہدایت کی سوغات حاصل کرنی ہے، اور اللہ کے بندوں میں تقسیم کرنی ہے، ذمہ داری کے احساس نے لرزا دیا، حرا کی چوٹیوں سے اترے اور امت کی ماں حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے گھبرائے، ڈرے، سہمے اور کپکپائے پہنچے، صورتِ حال بیان کی، حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی اور غمخواری و دلداری کا فرض اس طور پر ادا کیا جو انہیں کا حق تھا۔ عرض کناں ہوئیں :

" كلا و الله ما يخزيك الله أبداً ، إنك لتصل الرحم ، و تكسب المعدوم ، و تقرى الضيف ، و تعين على نوائب الحق "

" خدا کی قسم! ہرگز اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا، آپ رشتہ داروں کا حق ادا کرتے ہیں، لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، ناداروں کو کما کر لاتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے راستہ میں آنے والی مصیبتوں میں کام آتے ہیں۔" (۱)

بیوی سے بڑھ کر انسان کے مزاج و اخلاق، اس کے شب و روز، اس کی خوبیوں اور خامیوں اور اس کی نیکیوں و کوتاہیوں سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا اور شوہر کے کردار پر اس سے بڑھ کر کسی کی گواہی معتبر و مستند اور چشم دید نہیں ہو سکتی؛ یہ بیوی کی گواہی شوہر کے حق میں ہے۔ اس واقعہ میں بھی ایک اسوہ و نمونہ ہے کہ ایک مسلمان کو اپنے سماج میں کس کردار کا حامل ہونا چاہیے اور سماج کے مختلف طبقات کے ساتھ اسے کیا سلوک و برتاؤ رکھنا چاہیے، رشتہ داروں کے ساتھ، مہمانوں اور آنے جانے والوں کے ساتھ، غریبوں اور پریشان حالوں کے ساتھ مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اپنے ہوں یا پرائے۔ یہی کردار ہے جو داعی کی بات میں وزن اور اس کی دعوت میں اثر پیدا کرتا ہے۔ جس دعوت کے پیچھے عمل نہ ہو، اخلاق نہ ہو، انسان کی محبت نہ ہو اور کردار کی بلندی نہ ہو، وہ ایک بے روح دعوت ہے، وہ شیر نہیں بلکہ شیر کا مجسمہ ہے اور پھول نہیں بلکہ پھول کا کھلونا ہے۔

☆☆☆

جب آپؐ نبوت سے سرفراز کیے گئے، تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا، کہ پہلے اپنے گھر اور خاندان سے تبلیغ دین کا آغاز کریں، وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ (شعراء : ۲۱۴) چنانچہ آپؐ نے قبیلہ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کو کھانے پر مدعو کیا، لوگ جمع ہوئے، آپؐ نے کھانا کھلایا، پھر ان کے سامنے دعوتِ اسلام

(۱) بخاری، باب بدء الوحی

پیش کی، ابو لہب نے سختی سے انکار کیا اور برا بھلا بھی کہا، خاندان کے دوسرے بزرگ و عزیز بھی خاموش ہی رہے، یہ بھی گویا اخلاق و مروّت کے دائرہ میں رہتے ہوئے آپؐ کی دعوت سے انکار تھا، اس مجمع میں ایک کم سن لیکن بلند حوصلہ اور حقیقت پسند نوجوان تھا، جو کھڑا ہوا، اس نے آپؐ کی دعوت پر برملا لبیک کہا اور آپؐ کی مشن کے ساتھ بھرپور مدد کا عہد کیا، یہ نوجوان سیدنا حضرت علیؓ تھے۔(۱)

معلوم ہوا کہ دعوت و اصلاح کے کام میں کوشش کرنی چاہیے کہ ابتدا اپنے گھر اور خاندان سے ہو، ایسا نہ ہو کہ آپؐ ملک و بیرونِ ملک لوگوں کو دعوت دیں، شہروں شہروں، قریہ قریہ وعظ و تقریر کریں، آپ کے علم و تفقہ کا شہرہ دور دور تک ہو، لیکن آپ "برقی بلب" کے بجائے "مٹی کا چراغ" ہوں، بلب اپنے قریب کو بھی روشن کرتا ہے اور دور کو بھی اور چراغ کی روشنی دور تک پہنچتی ہے، لیکن اس کے گردو پیش اندھیرا رہتا ہے۔ جب آپ اپنے گھر کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دیں گے اور دوسروں کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں گے، تو یقیناً سوچنے والے سوچیں گے، زبانیں کھلیں گی اور انگلیاں اٹھیں گی کہ شاید یہ شخص اپنی دعوت میں مخلص نہیں، ورنہ ضرور تھا کہ اپنے بال بچوں کو اور گھر کے ماحول کو بھی راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتا۔ جب انسان کی دعوت و اصلاح "سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر" کا مصداق ہو، تو اس کی بات بے اثر ہو جاتی ہے۔

اس واقعہ سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ صالح تبلیغی و اصلاحی مقاصد کے لیے کھانے وغیرہ کی تقریبات کا منعقد کرنا، پہلے لوگوں کی ضیافت کر کے ان کو مانوس کرنا، پھر دینِ حق کی بات ان کے سامنے رکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ایک مؤثر طریقہ ہے؛ اس سے لوگوں میں انس پیدا ہوتا ہے، ہمدردی کا احساس ابھرتا ہے اور جب کسی آدمی سے محبت و انس ہو جائے تو یقیناً انسان اس کی بات سنجیدگی کے ساتھ اور قبول کرنے کے جذبہ سے سنتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مستقل طور پر کھانے کی دعوت بھی کی جاسکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ افطار پارٹی، عید ملاپ، ولیمہ اور عقیقہ وغیرہ کے عنوان سے غیر مسلم بھائیوں کو بلایا جائے اور موقع کی رعایت کرتے ہوئے ان کے سامنے اپنی بات رکھی جائے، اسی طرح میڈیکل کیمپ قائم کیے جائیں اور اس کو دعوتِ اسلام کے لیے ایک ذریعہ و وسیلہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔ افسوس کہ آج مسلمان سیاسی اور مادّی اغراض و مقاصد کے تحت ایسی تقریبات رکھتے ہیں اور کچھ غیر مسلم بھائیوں کو بھی اس میں شریک کر لیتے ہیں، لیکن دعوتی و تبلیغی مقاصد کے تحت ہمیں ایسی تقریبات منعقد کرنے کی توفیق نہیں ہوتی!

☆☆☆

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۳/۳۴۹-۳۵۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت کے عام اعلان واظہار کا حکم فرمایا گیا اور اسلام کی اعلانیہ اور کھلی ہوئی دعوت دینے کی ہدایت فرمائی گئی تو مکہ کے قدم دستور کے مطابق آپؐ صفا کی پہاڑی پر چڑھے، لوگوں کو کسی غیر معمولی بات کی اطلاع دینی ہوتی تو وہ اسی پہاڑی پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنا مدعی سناتے، کیوں کہ اسی پہاڑی کے قریب کعبۃ اللہ بھی تھا اور یہیں مکہ کی چھوٹی سی بستی بھی آباد تھی، لوگ جمع ہوئے، آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ میں نے تمہارے درمیان عمر کے چالیس سال گذارے ہیں، یہیں میں بچپن سے جوان ہوا، میرے روز و شب اور صبح و شام تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں، بتاؤ کہ تم نے مجھے کیسا پایا؟ لوگوں کی زبان پر ایک ہی کلمہ تھا کہ آپ "صادق" (سچے) اور "امین" (امانت دار) ہیں، آپؐ نے ان کے اعتماد و بھروسہ کا مزید امتحان لیا اور دریافت فرمایا: اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کی فوج کھڑی ہے اور وہ تم پر حملہ کرنے والی ہے، تو کیا تم اس کا یقین کرو گے؟ حاضرین نے کہا: کیوں نہیں، حالانکہ بظاہر اس وقت مکہ پر ان کے دشمنوں کی یلغار کا کوئی امکان نہیں تھا، پھر بھی انہوں نے اس کا مثبت جواب دیا، اس تصدیق و توثیق کے بعد آپؐ نے ان کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی۔(۱)

آپؐ کے اس طریقۂ دعوت سے ہمیں دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ ہر زمانہ و عہد میں جو جائز جدید ذرائع ابلاغ ہوں، دعوتِ دین کے لیے ان کا استعمال کرنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اہم کام کے لیے کوئی ایک ہی طریقہ متعین نہیں فرمایا، ہر عہد، ہر زمانہ اور ہر علاقہ کے مزاج و مذاق اور ذرائع ابلاغ کی ایجاد کے لحاظ سے مختلف وسائل سے دعوت الی اللہ کا کام لیا جائے، البتہ یہ ضروری ہے کہ ان وسائل کا استعمال شرعاً جائز ہو۔ صفا کی پہاڑی پر پہلے مشرکین بھی کسی اہم بات کے اعلان کے لیے چڑھا کرتے تھے، بلکہ اس پر بعض بت بھی نصب تھے، اس کے باوجود آپؐ نے اس قدیم طریقہ سے فائدہ اٹھایا، حج کے موقع سے میلے لگائے جاتے تھے اور لوگ اپنی اور اپنے خاندان کی بڑائی بیان کرنے کے لیے اجلاس منعقد کرتے تھے، عکاظ کا میلہ لگا کرتا تھا، جس میں رقص و سرور کی محفلیں بھی جمتی تھیں، آپؐ نے ان مواقع کو بھی دین حق کی تبلیغ کے لیے استعمال فرمایا، آپؐ خود بنفس نفیس وہاں تشریف لے گئے اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ داعی کو کردار و اخلاق کے اعتبار سے اپنے آپ کو اتنا اونچا رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کوئی شخص اس کی زندگی پر انگلی نہ اٹھا سکے۔ انبیاء اور دنیا کے سیاسی و سماجی قائدین کی زندگیوں کے درمیان سب سے نمایاں فرق یہی ہے، کہ دنیا کے قائدین اور خود ساختہ

(۱) تفسیر رازی: ۱۶/۱۵۷

رہبر اپنی "بات" تو پیش کرتے ہیں، لیکن اپنی "ذات" کو پیش کرنے کی ہمت نہیں کرپاتے، وہ اپنے پروگرام لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں، وہ "مینی فیسٹو" پیش کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ مجھے ووٹ دو، میں تمہارے محلّہ میں شہد کی نہریں بہادوں گا، لیکن ان میں یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنی ذات کو پیش کرسکیں، کہ میں نے تمہارے ہی درمیان اپنا بچپن اور جوانی گذاری ہے، اگر ہم نے کہیں بددیانتی کی ہو، دروغ گوئی کی ہو، ظلم وزیاتی کی ہو، تو کوئی انگلی اٹھائے، کیوں کہ ان کی زندگی "تن ہمہ داغ داغ شد" کا مصداق ہوتی ہے۔ دین حق کے داعی کو بہر حال اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی زندگی ایسی داغدار نہ ہو اور وہ اس موقف میں ہو کہ اپنی بات سے پہلے لوگوں پر اپنی "ذات" کو پیش کرسکے۔

☆☆☆

حیاتِ طیبہ کا ایک اہم سبق یہ ہے کہ ہر کام و اقدام کے لیے مناسب وقت کا انتخاب کیا جائے، بہتر سے بہتر کام ہو، لیکن قبل از وقت ہو تو مفید کے بجائے مضر ہو جاتا ہے۔ مکہ کی زندگی میں مسلمان کیا کچھ ابتلاؤں سے نہیں گذرے؟ حضرت بلالؓ ہیں جن کے گلے میں رسّی ڈال کر گلی گلی، کوچہ کوچہ گرم ریت پر گھسیٹا جارہا ہے، جسم زخموں سے چور ہے اور زبان پر "اللہ احد، اللہ احد" کے کلمات ہیں، یہ حضرت خبابؓ ہیں، جن کو سلگتے ہوئے کوئلوں پر اور دھوپ کی تپش سے گرم اور شعلہ آور پتھروں پر ننگی پیٹھ کے ساتھ لٹا دیا جاتا ہے اور سینہ پر پتھر ہے کہ حرکت نہ کرسکیں، جب تک جسم سے رِسنے والا لہو کوئلے کو بجھا نہ دے اٹھنے کی اجازت نہیں ہے، حضرت عمارؓ اور ان کے والد پر ناقابل برداشت مظالم ہو رہے ہیں، ان کی والدہ حضرت سمیہؓ کو نہایت بے دردی و بے آبروئی کے ساتھ برسر عام شہید کیا جاتا ہے، حضرت ابو بکرؓ جیسے تاجر کو اتنا زدوکوب کیا جاتا ہے کہ بیہوش ہو جاتے ہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشتِ مبارک پر اونٹ کی اوجھ رکھی جاتی ہے اور گلے میں پھندا ڈالا جاتا ہے، ان مصیبتوں اور آزمائشوں نے مسلمانوں کو تڑپا دیا اور وہ بے قرار ہیں کہ کم سے کم اجازتِ جہاد مل جائے کہ وہ ان مظالم کا جواب تو دے سکیں، لیکن ابھی آپ کی طرف سے صبر کی تلقین ہوتی ہے، حضرت عمارؓ سے فرماتے ہیں: "صبراً آل یاسر" (۱) کیوں کہ آپؐ جانتے تھے کہ یہ مظلومیت مسلمانوں کی اخلاقی فتح ہے، ان حالات سے یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ اہل مکہ کے پاس نبوتِ محمدی سے انکار کے لیے کوئی دلیل نہیں، اس لیے یہ ظلم وجور کا سہارا لے رہے ہیں اور ابھی اہل مکہ پر حجت کا اتمام باقی تھا، نیز یہ بات بھی ظاہر تھی کہ مسلمانوں کی کوئی الگ آبادی نہ تھی، ان کی تعداد

بھی کم تھی اور وہ ایک ملے جلے سماج میں رہ رہے تھے، اس فضا میں مسلمانوں کے لیے جہاد عملاً خود کشی کے مترادف ہوتا، اس لیے آپؐ نے قوتِ برداشت سے کام لیا، کعبہ پر مشرکین کا قبضہ گوارا کیا، کعبہ کے اندر اور باہر بتوں کے وجود کو دیکھتے رہے اور خاموش رہے کہ اس وقت بے برداشت ہو جانا اور بے صبری کا ثبوت دینا اسلام کے وجود ہی کو خطرہ میں ڈال سکتا تھا۔ یہ ایک اہم سبق ہے جس کو زندگی کے ہر مرحلہ میں پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے؛ بے موقع اشتعال اور بے صبری دشمنوں کو فائدہ پہنچاتی ہے اور خود کو نقصان۔ اس وقت پوری دنیا میں مسلمان جذبات کی رو میں بہہ جانے اور وقت سے پہلے قدم اٹھانے کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ کاش وہ اس پہلو سے آپؐ کی سیرت کا مطالعہ کریں!

ٹھیک اس وقت جب آپؐ پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے، ایک عجیب واقعہ پیش آیا، مکہ میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل نے ایک دن آپؐ کو بہت برا بھلا کہا اور آپؐ کے ساتھ نہایت ہی نازیبا اور ناشائستہ رویہ اختیار کیا، اللہ کے راستہ میں جو دکھ سہنا پڑتا، آپؐ کبھی اس کو اپنی زبان پر نہیں لاتے، چنانچہ آپؐ نے خود کچھ نہیں فرمایا، لیکن حضرت حمزہؓ کی باندی یہ سب سن رہی تھیں، حضرت حمزہؓ شکار کے خوگر تھے، سرِ شام واپس آئے تو باندی نے یہ قصہ سنایا اور عار بھی دلائی، کہ جو کچھ ابو جہل نے تمہارے بھتیجہ کے ساتھ کیا، اگر تم اس کے بھتیجہ کے ساتھ کرتے، تو وہ یوں ہی نہ چھوڑتا، خاندانی محبت رنگ لائی اور حضرت حمزہؓ جوش میں ابل پڑے، ابو جہل کی تلاش میں نکلے اور صحن کعبہ میں اسے موجود پایا اور اپنی کمان سے ایسا وار کیا کہ ابو جہل کے سر پر گہری چوٹ آئی، لوگوں نے کچھ کہنا چاہا، تو خود ابو جہل نے منع کر دیا اور کہا کہ میں نے اس کے بھتیجہ کو بہت برا بھلا کہا ہے۔

حضرت حمزہؓ فاتحانہ مسرت کے ساتھ حضورؐ کے پاس آئے اور فرمایا کہ: میں نے آج ابو جہل سے تمہارا بدلہ لے لیا، اگر کوئی اور شخص ہوتا تو کتنا خوش ہوتا! لیکن آپؐ نے اس پر ذرا بھی خوشی کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا: مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں، مجھے تو اس وقت خوشی ہوگی جب خود آپ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھ لیں، حضرت حمزہؓ کے جوش پر اس کلمہ، ہوش نے کام کیا اور انہوں نے فوراً ہی کلمۂ شہادت پڑھ لیا اور اسلام لے آئے۔ یہ داعیانہ اسپرٹ ہے۔ داعی کو اس بات سے خوش نہ ہونا چاہیے کہ اس کے فلاں مخالف اور معاند کی تذلیل ہوئی ہے، اس کو مار پیٹ کیا گیا ہے، اس کے قلب کو ہمیشہ آئینہ کی طرف صاف اور اپنے مثبت مشن کے لیے بے قرار و بے تاب ہونا چاہیے اس کو صرف اس بات کی فکر ہو کہ کیوں کر اس کی دعوت مقبول ہوگی، یہی اس کی خوشی کا سامان ہو اور یہی اس کے دکھ کا باعث؛ اگر دعوت کے ساتھ شخصی اغراض اور خصومتیں شریک ہو جائیں تو وہ بے اثر اور بے فیض ہو جاتی ہے۔

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۳۲۰

☆☆☆

نبوت کے ابتدائی زمانہ میں جن لوگوں نے شدت سے اسلام کی مخالفت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے کے درپے رہے، ان میں حضرت عمرؓ بن خطاب اور عمرو بن ہشام یعنی ابو جہل کے نام سر فہرست ہیں، یہ بڑے زور آور بھی تھے اور کمزور مسلمانوں پر بڑے ستم روا رکھتے تھے، متعدد ایسے واقعات ہوئے جس نے حضرت عمرؓ کے دل کی کایا پلٹ دی اور جو شخص پیغمبر اسلامؐ کے خون کا پیاسا تھا، وہی آپؐ کے لیے خون بہانے اور جان و تن نثار کرنے والا بن گیا۔

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے سلسلہ میں ایک اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کی مخالفت کو دیکھتے ہوئے آپؐ نے ان کے لیے بد دعا کرنے اور انتقام کی تدبیریں سوچنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا اور التجا کی کہ: الہا! عمرو بن ہشام یا عمر بن خطاب میں سے کسی سے اسلام کو قوت پہنچا! اللهم ! أيد الإسلام بعمرو بن بن هشام أو بعمر بن الخطاب .(۱) حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ اسی نالہ و نیم شبی کا ظہور تھا، داعی و مبلغ کو اس قوم کے ایمان لانے کے بارے میں اسی طرح بے چین ہونا چاہیے جس کو وہ دعوت دے رہا ہے، وہ دن میں اللہ کے بندوں کی خوشامد کرے، ان کی زبان اور مزاج کی ناہمواریوں کو سہے اور راتوں کو خدا کے سامنے گڑگڑائے، تڑپے اور آنسوؤں سے وضو کرے۔ یہی بے قراری و کسک اور آہِ سحر گاہی رنگ لاتی ہے اور دلوں کے بند دروازوں کو کھولنے کا باعث ہوتی ہے کہ "دعا" داعی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے!

☆☆☆

حیاتِ طیبہ میں شاید سب سے زیادہ ابتلاء و آزمائش کا دن وہ تھا، جب آپؐ اہل مکہ سے مایوس ہو کر طائف پہنچے تھے، یہ صحرائے حجاز میں سر سبز و شادابی اور تمدن و ثقافت کا گویا ایک جزیرہ تھا، آپؐ بھی امیدیں لے کر یہاں تشریف لائے تھے اور توقع رکھتے تھے کہ شاید اسی دیار کے لوگ ایمان لے آئیں، لیکن ابھی ان کے لیے ایمان مقدر نہیں تھا، لوگوں نے دعوتِ حق سے انکار ہی نہیں کیا، بلکہ نہایت شدت کے ساتھ آپؐ کی مخالفت کی اور یہ مخالفت زبان ہی تک محدود نہ رہی بلکہ بستی کے اوباش لڑکوں اور بد معاش نوجوانوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا، آپؐ کے ساتھ رفیقِ سفر صرف حضرت زیدؓ بن حارثہ تھے، یہ اوباش آپؐ پر پتھر پھینکتے، خاک اڑاتے، جسم لہو لہان ہو گیا، نعلین مبارکین میں خون کی تہیں جم گئیں، چلنے کی تاب نہ رہی، تھک کر بیٹھ جاتے تو بیٹھنے بھی نہ دیتے، آخر حضرت زیدؓ نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور ایک باغ کی پناہ لی۔

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۳۴۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر جو دعا فرمائی، وہ اتنی اثر انگیز ہے کہ گویا خونِ جگر اور دردِ دل نے الفاظ کی صورت اختیار کرلی ہو۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی:

" اللّٰهم إليك أشكو ضعف قوّتي وقلّة حيلتي، وهواني على الناس، يا أرحم الراحمين! أنت رب المستضعفين و أنت ربي إلى من تكلني: إلى بعيد يتجهمني أم إلى عدو ملكته أمري؟ إن لم يكن بك علي غضب فلا أبالي، و لكن عافيتك هي أوسع لي، أعوذ بنورِ وجهك الذي أشرقت له الظلمات وصلح عليه أمر الدنيا و الآخرة، من أن تنزل بي غضبك أو يحل علي سخطك، لك العتبى حتى ترضى، و لا حول و لا قوة إلا بك!" (۱)

"الٰہی! اپنے ضعف و بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی بے بسی کی فریاد آپ ہی سے کرتا ہوں۔ آپ رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں، درماندہ بیکسوں کے پروردگار آپ ہی ہیں، آپ ہی میرے مالک ہیں۔ آخر آپ مجھے کس کے حوالے کررہے ہیں کیا اس حریف بیگانہ کے جو مجھ سے ترش روئی روا رکھتا ہے یا ایسے دشمن کے جو میرے معاملہ پر قابو رکھتا ہے؛ لیکن اگر مجھ پر آپ کا غضب نہیں ہے تو پھر مجھے کچھ پرواہ نہیں، بس آپ کی عافیت میرے لیے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ میں اس بات کے مقابلہ میں کہ آپ کا غضب مجھ پر پڑے یا آپ کا عذاب مجھ پر نازل ہو آپ ہی کے نورِ جمال کی پناہ مانگتا ہوں، جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور جس کے ذریعہ دین و دنیا کے جملہ معاملات سور جاتے ہیں۔ مجھے تو آپکی رضامندی اور خوشنودی مطلوب ہے۔ آپ کے سوا کہیں سے کوئی قوت و طاقت نہیں مل سکتی۔"

ایک پیغمبرؐ کی دعا ہے، جس کے لفظ لفظ سے خود سپردگی اور اللہ کے سامنے سرافندگی ظاہر ہے۔ یہ ایسا دلدوز اور حوصلہ شکن واقعہ ہے کہ مضبوط سے مضبوط آدمی کی کمر ہمت ٹوٹ جائے اور انسان اپنے مشن کے بارے میں حوصلہ ہار دے، لیکن اس کے باوجود آپؐ کے پایۂ استقلال میں کوئی تزلزل نہیں آیا اور آپؐ نے اپنے مشن کو جاری وساری رکھا، لیکن کیا آپ کا یہ مشن ناکام ہوگیا؟ نہیں! اللہ تعالیٰ نے طائف کی زمین پر آپ کی اس محنت کو اگلی نسلوں میں ظاہر فرمایا اور انہیں معاندین و منکرین کی نسلوں سے وہ لوگ اٹھے جنہوں نے جھوٹے مدعیانِ نبوت سے اسلام کی حفاظت وصیانت کا فریضہ سرانجام دیا۔ پس داعی کو خواہ کتنے بھی حوصلہ شکن حالات ہوں ہمت نہ ہارنی چاہیے، نہ کسی قوم سے مایوس ہونا چاہیے، کہ اکثر جن قوموں نے شدومد سے اسلام کی مخالفت کی ہے وہی بالآخر اسلام

(۱) تہذیب سیرۃ ابن ہشام: / ۱۰۲-۱۰۳

آغوش میں آئی ہیں۔ یہ نظامِ قدرت ہے کہ رات کی تہہ در تہہ تاریکی سے صبح کی پو پھوٹتی ہے اور
ب تمازت اپنے انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو وہی بارانِ رحمت کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

☆☆☆

سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک اہم اور تاریخی موڑ ہجرت کا واقعہ ہے۔ ہجرت سے پہلے کا زمانہ
لمانوں کی مجبور و مقہوری کا دور تھا، وہ کھلے عام نماز تک نہیں پڑھ سکتے تھے، نہ قرآن کی تلاوت کر
۔ تھے، ہجرت نے مسلمانوں کو ایک نئی قوت عطا کی، بعد کو جو فتح مندیاں مسلمانوں کو حاصل ہوئیں،
ہی قربانی کا ثمرہ ہیں، جب مکہ کے ایک ایک متنفس تک آپ ﷺ اسلام کی دعوت پہنچا چکے اور کوئی کچا
پکا گھر ایسا نہ رہ گیا جس کو آپ ﷺ نے دینِ حق کی طرف نہ بلایا ہو، تو اب آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف
دین کی حفاظت و صیانت کے لیے ترکِ وطن کی اجازت مرحمت فرمائی گئی، ادھر اہل مکہ نے آپ ﷺ
قتل کے منصوبے بنائے، رات کا وقت ہے اور قاتلوں نے چاروں طرف سے گھر کا محاصرہ کر رکھا
، اس وقت بھی اہل مکہ کیں اور جانی دشمنوں کی بہت سی امانتیں آپ ﷺ کے پاس ہیں، آپ ﷺ نے یہ
ں حضرت علیؓ کے سپرد کی اور قرآن کی ایک آیت پڑھتے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے۔(۱)

اپنے رفیق خاص حضرت ابو بکرؓ کے گھر پہنچے اور حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ ہی معمول کا راستہ
۔ کر کسی قدر دور کا راستہ اپنایا، پہلے غارِ ثور پہنچے، جبل ثور کے دامن میں پہنچ کر حضرت ابو بکرؓ نے
کو اپنے کاندھے پر اٹھالیا اور نشاناتِ قدم مٹاتے ہوئے غارِ ثور تک پہنچے، عرب بڑے قیافہ شناس
تے تھے اور نشانِ قدم سے لوگوں کی آمد و رفت کا اندازہ لگایا کرتے تھے، جبل ثور کے دامن میں پہنچ
ضرت ابو بکرؓ نے آپ ﷺ کو اپنے کاندھے پر اٹھالیا اور نشاناتِ قدم مٹاتے ہوئے، غارِ ثور تک پہنچے،
ونوں یہیں مقیم رہے، پھر مدینہ کی سمت روانہ ہوئے۔(۲)

غور فرمائیے کہ دشمنی قتل و خون تک جا پہنچی اور اعداء تلوار سونتے ہوئے گھر کا محاصر کیے
ئے، لیکن امانت و دیانت کا اتنا اعتبار ہے کہ اب بھی اسی کے پاس امانتیں رکھوائی جاتی ہیں، پھر دیانت
ں و لحاظ بھی ملاحظہ کیجیے۔ یہ کچھ مسلمانوں کی امانت نہ تھی، کافروں کی تھی، حربیوں اور جانی
ں کی تھی، پھر جہاں جانا تھا وہاں کے احوال پوری طرح معلوم نہ تھے، معاشی تنگی سے دوچار اور
ستی کا شکار تھے، اگر ان امانتوں کو ساتھ لیے ہوئے ہی چلے جاتے اور واپس نہ لوٹاتے، تو کون سی
ب بات ہوتی؟ لیکن اس وقت بھی امانت و دیانت کا اتنا لحاظ کہ حضرت علیؓ کی جان کو خطرہ میں
ر امانتیں ان کے حوالہ کیں اور بارِ امانت سے ہلکے ہو کر تشریف لے گئے۔ یہ آپ ﷺ کی زبردست

ایۃ والنہایۃ: ۳/۷۵-۱۷۷ (۲) البدایۃ والنہایۃ: ۳/۱۸۰

اخلاقی فتح تھی کہ مخالفین بھی آپؐ کے اخلاقِ کریمہ پر انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کرتے تھے اور سمجھدار لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوتے تھے کہ جو دنیا کے معاملہ میں اتنا امانت دار ہے، کیا دین واحکام کے معاملہ میں خیانت کا مرتکب ہوگا؟

پھر آپؐ نے اپنے عمل سے یہ تعلیم دی کہ حسن تدبیر اور حکمتِ عملی، تقویٰ اور دینداری کے منافی نہیں۔ دنیا میں جو اسباب حفاظت و بچاؤ کے ہوتے ہیں، ان کو بھی آپؐ نے استعمال فرمایا، مانوس راستہ کو چھوڑ کر غیر مانوس راستہ اختیار کیا، نشاناتِ قدم مٹانے کی کوشش کی، جب کوہِ ثور سے مدینہ کی طرف گئے تو ایک راستہ بتانے والے کو بھی ساتھ رکھا، حضرت ابو بکرؓ تو ساتھ تھے ہی، جب کوئی پوچھنے والا حضرت ابو بکرؓ سے پوچھتا یہ کون ہیں؟ تو توریہ سے کام لیتے اور فرماتے کہ راستہ بتانے والے ہیں۔

☆☆☆

سفر طے کرتے ہوئے ۱۲/ ربیع الاوّل بروزِ پیر آپؐ مدینہ تشریف لائے۔ یا تو اہل مکہ نے آپ کو ٹھوکرایا تھا اور یا مدینہ کی خاک پاک آپؐ کے لیے سراپا انتظار تھی۔ حضرت ابو بکرؓ آپؐ کے ساتھ تھے، لوگوں کو پہچاننا دشوار ہو رہا تھا کہ کون رسول اللہ ہیں اور کون ان کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ ہیں؟ جب حضرت ابو بکرؓ نے آپ کو رومال کا سایہ کیا، تب لوگوں نے آپ کو پہچانا۔ مدینہ میں ہر شخص ملتجی تھا کہ آپؐ اس کے گھر کو اپنے وجود سے رونق بخشیں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ اونٹنی خدا کی طرف سے مامور ہے، جہاں رکے گی وہیں قیام ہوگا۔ آخر اونٹنی حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان کے سامنے بیٹھی اور آپؐ کے قیام کی سعادت اسی مکان کے حصہ میں آئی۔(۱)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپؐ اپنے رفقاء کے ساتھ کس قدر سادہ انداز پر رہتے تھے، نہ حشم و خدم اور نہ ہٹو بچو، لوگوں کو امتیاز بھی دشوار ہو جاتا کہ کون رسول ہیں اور کون ان کے رفقاء۔ آج ہماری معاشرت میں یہ بات مفقود ہو گئی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دولت و عزت دے، تو اپنے گرد خادموں کے ایسی حصار بندی کرتا ہے کہ جو اس کی حیثیت سے بھی زیادہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دوستوں کے ساتھ بے تکلف رہتے تھے، ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا ہوتا تھا، ہنسی مذاق بھی کر لیتے تھے، لوگوں کو آپؐ سے اپنی بات کہنے میں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا، اپنے رفقاء سے زیادہ معمولی حالات میں زندگی گذارتے تھے اور سلطان ہو کر بھی درویشوں کا طور و طریق نہ چھوڑتے تھے، اپنے قیام کے لیے خود کسی جگہ کا انتخاب نہ کر کے ساتھیوں کی دلداری اور دلجوئی مقصود تھی، حالانکہ مدینہ آپ کا ننیہال بھی تھا اور آپؐ کے دادا کا سسرال بھی، آپ ان گھروں میں اتر سکتے تھے، لیکن تمام ساتھیوں کے ساتھ

(۱) زاد المعاد: ۱/ ۱۰۱-۱۰۲، البدایۃ والنہایۃ: ۳/ ۱۸۶

مساویانہ سلوک اور ان کی دلجوئی کا خیال کرتے ہوئے اپنی طرف سے کوئی جگہ متعین نہیں کی۔

☆☆☆

مکہ کے بے سر و سامان لوگوں کا ایک بڑا قافلہ تھا، جو مدینہ میں خیمہ زن تھا، ان مہاجرین کو ہر گھر پر تقسیم کر دیا گیا۔ دنیا کی تاریخ میں انصار جیسی ایثار پیشہ قوم کی شاید کوئی مثال ملے، جس نے کمزور معیشت کے باوجود بھی اپنا سب کچھ اسلام کے قدموں میں ڈال دیا۔ چند دنوں میں اطمینان کی سانس لینے کے بعد سب سے پہلے آپؐ نے مسجد نبوی کے لیے زمین خریدی اور خود بنفس نفیس اس کی قیمت ادا فرمائی۔ مسجد کی تعمیر کیا تھی؟ کچھ پتھر جنہیں مٹی کے گاڑے سے چن دیا گیا، کچی زمین تھی، جب بارش کی وجہ سے کیچڑ ہونے لگا، تو لوگوں نے اس پر سنگریزے بچھا دیئے، محض آٹھ فٹ اونچی چھت تھی، وہ بھی کھجور کے پتوں اور چھالوں کی، اس سے دھوپ بھی چھن کر آتی اور بارش کا پانی بھی اچھا خاصا مسجد کے اندر آجاتا، یہی خس پوش، ظاہری حسن و آرائش سے عاری اور شوکت و شکوہ سے خالی مسجد تھی؛ جو مسجد حرام کے بعد دنیا کی سب سے افضل ترین مسجد ہے۔

مقام فکر و عبرت ہے کہ حضورؐ ابھی خود بے گھر و در ہیں، حالانکہ صاحبِ عیال ہیں، لیکن اپنے گھر کی فکر نہیں ہے، پہلے اللہ کے گھر کی فکر ہے، پہلے مسجد تعمیر فرمائی اور وہ بھی اس شان سے تعمیر کی کہ بذاتِ خود پتھر اٹھانے میں شامل رہے(۱) جاں نثاروں نے درخواست بھی کی کہ خدام حاضر ہیں، زحمت نہ فرمائیں، لیکن گوارا نہ ہوا کہ مسجد کی تعمیر میں شرکت سے محروم رہا جائے۔ پس مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے گھر سے پہلے اللہ کے گھر کی فکر کریں؛ محض پیسوں کا دے دینا کافی نہیں ، یہ تو گداگروں اور بھیکاریوں کو بھی دیا جاتا ہے، بلکہ دو چار اینٹ خود بھی اٹھائیں اور غبار آلود ہوں۔ یہ بھی قیامت میں گواہ ہوں گے۔ مسجد کی تعمیر میں اہمیت اس کی نہیں کہ کیسے قیمتی پتھر استعمال کیے، نقش و نگار کتنا عمدہ کیا، تعمیر پر پیسے کتنے خرچ کیے؟ بلکہ اہمیت اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے جذبہ کی ہے۔ خلوص کی قوت اور اللہ کی رضاجوئی کا جذبہ رائی کو پہاڑ بنا دیتا ہے اور ریا و نمائش کا جذبہ پہاڑ کو رائی کی طرح بے وزن۔

☆☆☆

ابھی ہجرت کا دوسرا سال ہے، مسلمانوں نے اطمینان کی سانس نہ لی کہ اہل مکہ کی طرف سے اہل ایمان کی اس چھوٹی سی بستی کو اجاڑنے کی سازش شروع ہوگئی اور بدر کے میدان میں یہ سازش پوری طرح ظہور پذیر ہوئی۔ ایک طرف تین سو تیرہ مسلمان فاقہ مستی سے دوچار اور اسلحہ کی کمی کا شکار،

(۱) (سیرت ابن ہشام ۱/ ۴۴۲)

دوسری طرف اہل مکہ کی تعداد قریب ایک ہزار جس میں عرب کے بڑے بڑے سورما بر سر پیکار۔ آ
نے اپنے ساتھیوں کی صف بندی کی، کچھ نصیحت فرمائی اور میدانِ جنگ کے ایک کنارے ایک چھپر
نیچے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے، کہ الٰہا! آج اگر یہ چھوٹی سی جماعت ہلاک کر دی جائے تو شاید
کبھی زمین پر آپ کی عبادت نہ ہو پائے۔ معرکہ کارزار گرم ہوا، مسلمانوں کو فتح ہوئی، مکہ کے بڑ
بڑے ستر سورما و سردار قتل ہوئے اور ستر قید کیے گئے۔ یہ قیدی کون تھے؟ شب و روز مسلمانوں پ
ڈھانے والے، جفاکش اور جفا شعار! آج وقت تھا کہ آتش انتقام بھڑکتی اور یہ سب اس میں خاک
ہو جاتے، لیکن نبی رحمت کا دامن عفو ان کے جرم سے بھی زیادہ وسیع تھا، جو اصحابِ ثروت تھے، انکی فد
لے کر رہائی ہوئی، جو اصحابِ علم تھے، دس مسلمانوں کو نوشت و خواند سکھانا ان کا فدیہ قرار پایا۔ کیا ذ
و رسوائی کے ساتھ یہ قیدی رخصت کیے گئے؟ نہیں! عزت و محبت کے ساتھ، نئے جوڑے پہنا کر،
بھوکے رہے انکو کھلایا، خود کپڑے میسر نہیں انکو پہنایا اور ایک مہمان کی طرح آپؐ نے انکو رخصت فرمایا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سبق میں کتنا بڑا سبق ہے؟ مسلمانوں کو کبھی اپنی طا
پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، اس کا یقین اللہ کی مدد و نصرت پر ہو، اس کے ہاتھ خدا کی بارگاہ میں
ہوئے ہوں، وہ دنیا کی بڑی و چھوٹی اور مغربی و مشرقی طاقتوں کی منت و سماجت کرنے کے بجائے
احکم الحاکمین سے مانگے، کیوں کہ ساری طاقتوں کا خزانہ اسی کے پاس ہے، وہ میدانِ جنگ میں بہادر
لیکن میدانِ جنگ سے باہر اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ بھی خلیق، نرم خو اور نرم گفتار، تاکہ وہ دل
کو فتح کر سکے اور اس کی اخلاقی عظمت ذہنوں میں بیٹھ جائے۔ اس واقعہ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے
آپؐ نے ان قیدیوں سے مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام فرمایا۔ ظاہر ہے کہ یہ دین کی تعلیم
تھی، پس علم جو بھی ہو، اگر نافع ہو، تو وہ مومن کے گمشدہ مال کی طرح ہے، علم خواہ اپنے دشمنوں
پاس ہو، لیکن ان سے بھی حاصل کرنا ہے، علم و فن کے حاصل کرنے میں دوست و دشمن کی کوئی تفر
نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر تمام قیدیوں سے مالی فدیہ ہی لینے پر اصرار کرتے تو شاید غر
و افلاس اور فقر و فاقہ کے اس دور میں یہ بات بظاہر سود مند تھی، لیکن آپؐ نے اس عمل کے ذریعہ ام
کو یہ سبق دیا کہ اگر علم حاصل کرنے کے لیے پیٹ کاٹنا اور فاقہ مستی برداشت کرنی پڑے تو اسے بھی گو
کیا جائے، لیکن اپنی نسلوں کے لیے علم سے محرومی اور جہالت کو کسی طور قبول نہ کیا جائے۔ اگر مسلم
اس حقیقت کو سمجھ لیں، تو شاید بہت جلد وہ موجودہ تعلیمی پسماندگی کے دلدل سے باہر نکل آئیں۔

☆☆☆

(۱) (سیرت ابن ہشام: ۳/ ۶۲۶-۶۲۷)

غزوۂ بدر کے دوسرے ہی سال مسلمانوں کا اہل مکہ سے دوسرا معرکہ احد میں پیش آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ہدایات کی نادانستہ خلاف ورزی اور کچھ صحابہ کی اجتہادی لغزش کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ مسلمانوں کے لیے ایک گونہ ہزیمت سے تبدیل ہو گئی۔ دشمنوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ وہ خود آپؐ تک پہنچ گئے اور آپؐ پر بھی وار کیے، دندانِ مبارک شہید ہو گئے، رخسارِ مبارک زخمی اور جسم خون سے لہولہان ہے،(۱) لیکن اس حال میں بھی زبان پر دعا ہی کے کلمات ہیں، کہ بار الہا! یہ مقامِ نبوت سے ناآشنا اور ناواقف ہیں، ممکن ہے کہ ان کی نسلوں میں اہل ایمان پیدا ہوں۔

کتنا بڑا درس ہے ہم تہی دامانِ علم کے لیے کہ کافروں کی طرف سے خواہ کتنی بھی زیادتی ہو اور کتنا بھی دکھ پہنچے امید توڑی نہ جائے اور انسان مایوسی کو اپنا شیوہ نہ بنائے، امید رکھیں کہ آج نہ کل وہ ایمان لائیں گے اور عین اس وقت جب جسم ان کے تیروں سے لہولہان ہو، آنکھیں ان کی محبت میں اشک بار، خدا سے ان کے لیے ایمان کے طلب گار ہوں۔

☆☆☆

ہجرت کے پانچویں سال غزوۂ خندق کا واقعہ پیش آیا۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی اس چھوٹی سی نو آباد اور بے سروسامان بستی کو اجاڑنے پورا عرب اکٹھا ہو رہا ہے اور نفرت وعداوت کے بادل جو ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے وہ آج گھنگور گھٹا کی صورت میں مدینہ پر اترنے کے لیے کمربستہ ہیں۔ آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا، جس کو آپؐ نے پسند اور قبول فرمایا اور بیس دنوں چھ ہزار گز طویل اور پانچ گز گہری اور دس گز چوڑی خندق کھودی گئی۔ آپؐ نے صرف رفقا کو خندق کھودنے پر مامور نہ فرمایا، بلکہ خود بھی اس مشکل کام میں شرکت فرمائی اور جو چٹانیں کسی سے ٹوٹ نہ پائیں آپؐ نے توڑیں۔ دشمن آندھی کی طرح آئے، لیکن اس خندق نے ان کے قدم روک دیئے۔ سرد ترین موسم میں بیس دنوں مدینہ کا محاصرہ جاری رہا۔ دشمنوں کا ٹڈی دل لشکر، تیروں کی یلغار اور خنک ہواؤں کے جھونکے، سامانِ اغذیہ کی قلت، یہ بڑا جاں گسل وقت تھا۔ یہودیوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ آپؐ نے بروقت اس بات کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ حضرت نعیمؓ بن مسعود اس مشکل گھڑی میں مشرف باسلام ہوئے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ تم ابھی اپنے ایمان لانے کو چھپاؤ اور کوئی ایسی تدبیر کرو کہ دشمنوں میں پھوٹ پڑ جائے۔ انہوں نے کمالِ ہوشمندی کے ساتھ اہل مکہ اور یہودیوں کے درمیان بے اعتمادی کی فضا پیدا کر دی اور آخر یہ فوج کشی خاسر و ناکام ہوئی۔ آپؐ کی زبان بد دعا کے لیے کبھی کھلتی نہ تھی، لیکن اس جنگ کے دوران جب آپ کی کئی نمازیں قضا ہو گئیں، تو

(۱) تہذیب سیرت ابن ہشام: ۱۱۱/

برداشت نہ ہوسکا اور دشمنوں کے لیے زبانِ مبارک سے کچھ بددعائیہ فقرے نکل گئے۔(۱)

معلوم ہوا کہ کسی بھی مشکل مہم میں زعماء و قائدین کو اپنے آپ کو امت کے عام لوگوں کی سطح پر رکھنا چاہیے اور ایک عام فرد کی طرح اس مہم میں شریک رہنا چاہیے، جیسا کہ حضورؐ بنفس نفیس خندق کو کھودنے میں شریک رہے کہ اس سے لوگوں کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ غلبہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے سیاسی تدابیر کا اختیار کرنا کوئی بری بات نہیں۔ جہاں ہمیں امت کے اتحاد کی کوشش کرنی چاہیے، وہیں اس بات کی بھی سعی کرنی چاہیے کہ دشمنانِ اسلام متحد نہ ہونے پائیں اور وہ پراگندہ و منتشر ہوں، ایک پراگندہ قوم کا مقابلہ بمقابلہ متحد قوم کے آسان ہے۔ ہندوستان میں مسلمان اس طریقہ کار سے بہت کچھ نفع اٹھا سکتے تھے۔ ہندو مذہب میں جو طبقاتی تقسیم ہے، وہ ایک ایسا غیر انسانی تصور ہے، جو خون اور خون میں فرق کرتا ہے، یہاں کی اکثریت کو تقسیم کرنے کے لیے یہ ایک طاقتور اور مؤثر ہتھیار ہے؛ لیکن افسوس کہ مسلمان اس ہتھیار کو استعمال کرنے میں ناکام رہے۔

واقعۂ خندق کا یہ پہلو بھی قابل عبرت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر شخصی زندگی میں کیسی کیسی مصیبتیں اور آزمائشیں آئیں؟ کون سی تکلیف تھی جو آپ کو پہنچائی نہ گئی ہو؟ لیکن کبھی زبان پر حرفِ شکایت نہ آیا اور دستِ رحمت بددعا کے لیے نہ اٹھ پائے، طائف کی ابتلاء میں بھی دعا ہی کی اور اُحد کے کارزار میں بھی لب دعا ہی کے لیے کھلے، لیکن غالباً دو موقعوں پر آپؐ نے اپنی ذات کی نسبت سے بددعا کی: ایک جب آپؐ صحن کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے اور سجدہ کی حالت میں تھے کہ کچھ شرپسندوں نے اونٹ کی اوجھ پشتِ مبارک پر رکھ دی، دوسرے غزوۂ خندق کے موقع سے جب چند نمازیں قضا ہوگئیں؛ گویا دونوں موقعوں پر دعا ان لوگوں سے متعلق ہے جنھوں نے نماز اور خدا کی بندگی میں خلل پیدا کیا اور رخنہ اندازی کی۔ اس سے نماز کی اہمیت اور آپؐ کی نگاہ میں اس کی عظمت معلوم ہوتی ہے۔

☆☆☆

آپؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک زریں باب "صلح حدیبیہ" ہے، جس کو قرآن مجید نے فتح مبین سے تعبیر کیا ہے۔ یہ صلح بظاہر مسلمانوں کی شکست محسوس ہوتی تھی، حضرت عمرؓ جیسے معاملہ فہم اور دانا شخص کو بھی اس صلح میں اپنی شکست کا احساس ہوا۔ بدر کے معرکہ میں تو صرف تین سو تیرہ صحابہ تھے، لیکن آج چودہ سو جاں نثار ساتھ ہیں اور چشم و ابرو کے اشارہ پر تعمیل حکم کے لیے تیار ہیں، احرام میں ملبوس قافلہ مکہ کے دروازہ تک آپہنچا۔ کسی محرم کو کعبہ کی زیارت سے محروم کرنا، خواہ دشمن کیوں نہ ہو عرب کی روایت نہ تھی، لیکن اہل مکہ کسی بھی قیمت پر اس بات کے لیے تیار نہ ہوئے کہ مسلمان اس سال عمرہ

(۱) البدایہ والنہایہ: ۴ / ۹۲-۱۱۶

کرلیں۔ آپ بغیر عمرہ کے واپس ہونے پر آمادہ ہوئے اور حدیبیہ کے صلح نامہ پر دستخط فرمایا، جس کی ہر شق سے بظاہر بزدلی اور شکست کی بو آتی تھی، صلح کی گفتگو میں بھی اہل مکہ نے بے مروّتی کا رویہ اختیار کیا، لیکن آخر حالات نے بتادیا کہ مسلمانوں کی یہ بہت بڑی فتح تھی، بدر اور خندق سے بھی بڑا فتح!

عداوت و دشمنی کا ماحول کسی مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع نہیں، آپؐ چاہتے تھے کہ اہل مکہ سے صلح اور دوستی کی فضا پیدا ہو، تا کہ باہم آمد و رفت ہو، وہ خالی الذہن ہو کر اسلام کے بارے میں سوچ سکیں اور جذبۂ نفرت سے عاری ہو کر مسلمانوں کے سلوک و اخلاق کو دیکھ سکیں، نیز اہل مکہ کی طرف سے ذہن فارغ ہو تو عرب کے دوسرے قبائل کو اور قرب وجوار کی مملکتوں کو اسلام کی دعوت دی جائے؛ چنانچہ صلح حدیبیہ ہوتے ہی آپؐ نے روم و ایران، حبش اور مختلف علاقوں میں اسلام کے دعوتی خطوط لکھے، تبلیغی مقصد کے لیے جا بجا صحابہ کے وفود روانہ کیے گئے اور اس کے مفید اثرات مرتب ہوئے۔ غور فرمائیے کہ صلح حدیبیہ کے موقع سے آپؐ کے ساتھ چودہ سو صحابہ ہیں، جو مکی زندگی کے تیرہ اور مدنی زندگی کے چھ سال یعنی کل انیس سالوں کی محنت کا قریب قریب خلاصہ ہیں، صلح حدیبیہ کے دو سالوں کے بعد جب آپؐ فتح مکہ کے موقع سے تشریف لاتے ہیں تو دس ہزار رفقاء آپ کی رکاب میں ہیں اور فتح مکہ کے دو سال بعد "حجۃ الوداع" کے موقع پر آپ کے ساتھ حج میں شرکت کرنے والے صحابہ اور صحابیات کم و بیش ایک لاکھ ہیں۔ زندگی کے آخری چار سالوں میں اسلام کی یہ تیز رفتار بلکہ برق رفتار پیش رفت صلح حدیبیہ ہی کا نتیجہ ہے۔ جب تک غیر مسلموں کے ساتھ میل جول، گفت و شنید اور تبادلۂ خیال کی معتدل فضا نہ پیدا ہو جائے، اسلام کی دعوت و اشاعت کا کام صحیح طور پر انجام نہیں پا سکتا۔ افسوس کہ مسلمانوں نے کبھی اس پہلو سے غور نہیں کیا اور انہوں نے اپنے پیغمبرؐ سے کانٹے بچھانے والوں کے لیے پھول بچھانے اور دکھ پہنچانے والوں کے لیے دستِ دعا اٹھانے کا سبق نہیں سیکھا۔

☆☆☆

سیرت میں ایک غزوہ بنو مصطلق نام سے معروف ہے۔ اس غزوہ میں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آگیا ایک مہاجر کے غلام اور ایک انصاری کے درمیان کچھ تو تو میں میں ہو گئی، بات دو شخص سے بڑھ کر دو طبقوں کی یعنی انصار و مہاجر کی بن گئی۔ منافقین ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے؛ چنانچہ منافقوں کے سردار عبد اللہ بن ابی نے اس معمولی واقعہ کو خراب رنگ دے دیا اور انصار سے کہا کہ مہاجرین کے ساتھ تمہارا معاملہ عربوں کے اس محاورہ کا سا ہے کہ اپنے کتے کو موٹا کرو تا کہ وہ تمہیں

کو نوالہ بنائے، "سمّن کلبك يأكلك" یہ بات ایک مخلص لیکن نوجوان صحابی حضرت زیدؓ بن ا
کے ذریعہ آپ ؐ تک پہنچی۔ آپؐ نے تحقیق شروع کی، تو انصار کے اکابر جو عبد اللہ بن ابی کے نفاق
واقف نہ تھے کہنے لگے: یہ بچہ کی بات ہے اس کا کیا اعتبار؟ حضرت عمرؓ نے اجازت طلب کی کہ اسی و
اس منافق کی گردن اڑادی جائے؛ لیکن آپؐ نے منع فرمایا اور اسی وقت قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم فر
لوگ چلے اور چلتے رہے۔ معمولِ مبارک تھا کہ جب شام میں سفر شروع ہوتا تو رات کے آخر میں
کرتے اور صبح میں سفر شروع ہوتا تو شام میں پڑاؤ کرتے، لیکن خلافِ معمول آپؐ کے حکم سے یہ قا
پوری رات اور پورا دن چلتا رہا، یہاں تک کہ دوسرے دن دوپہر میں چلچلاتی ہوئی دھوپ کے وق
قافلہ کو خیمہ زن ہونے کی اجازت ملی۔ سفر کے تسلسل سے لوگ پریشان تھے، سبھوں نے آرام کیا۔

پھر ایک وقت آیا کہ خود عبد اللہ بن ابی کے صاحبزادہ جو مخلص مسلمان تھے، خدمتِ اقد
میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے معلوم ہوا کہ آپ میرے والد کو قتل کرنے والے ہیں، یہ واق
منافق ہیں اور اس لائق ہیں، لیکن میں ان کا فرمانبردار بیٹا ہوں، میں ان کے قاتل کو برداشت نہیں
کرسکتا، اور اس طرح ایک کافر کی وجہ سے ایک مخلص مسلمان کی جان چلی جائے گی، تو اگر آپ کا
ارادہ ہو تو خود مجھے حکم فرمائیں، میں ان کا سر قلم کردوں۔ آپؐ نے اس سے منع کیا اور حضرت عمرؓ کو
کر صورتِ حال بتائی اگر میں اس وقت قتل کردیتا تو بھولے بھالے ذہن بزرگانِ انصار کو خیال ہوتا
میں نے زیادتی کی ہے، لیکن آج خود ان کے بیٹے ان کا سر قلم کرنے کو تیار ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض
کیا: یقیناً اللہ نے اپنے رسول کی رائے میں برکت رکھی ہے۔ "بارك الله في رأی رسوله"

موجودہ حالات میں ہمارے لیے یہ واقعہ بڑا سبق آموز ہے۔ مشتعل و بے برداشت ہو ج
اور قبل از وقت کسی قدم کا اٹھانا غلط فہمیوں کو جنم دیتا ہے اور نقصان کا باعث بنتا ہے؛ انتظار، صبر ا
اپنے آپ کو قابو میں رکھنا بظاہر شکست ہے، لیکن انجام کار کامیابی و فتح مندی!

☆☆☆

ہجرت کے آٹھویں سال مکہ فتح ہوا۔ جن لوگوں کو حقارت سے نکالا اور دھتکار اور ٹھکرایا گ
تھا، وہی آج مکہ میں فاتحانہ داخل ہو رہے ہیں، فتح و ظفرمندی کے ایسے موقعوں پر سپہ سالار کے سرا ٹھ
ہوئے اور گردنیں کبر سے اکڑی ہوئی ہیں اور زبان پر متکبرانہ نعرہ، اور مفتوحین کی تذلیل و تحقیر
لیکن آج کا سماں اس سے بالکل مختلف ہے، آپؐ اونٹنی پر بیٹھے ہوئے ہیں، خشوع و تضرع کی کیفیت
، سر اتنا جھکا ہوا ہے کہ بار بار جبین مبارک اونٹنی کے کوہان سے لگ جاتا ہے، فضا میں ایک سپاہی کی آوا

گونجتی ہے، کہ آج انتقام اور کشت وخون کا دن ہے، ألیوم یوم الملحمة، فوراً زبانِ رحمت ترجمان حرکت میں آتی ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ آج کا دن عفو وکرم کا دن ہے، ''ألیوم یوم المرحمة'' (۱)

فتح ونصرت کے قبا زیب تن کیے جب مکہ میں داخل ہوتے ہیں، تو اپنے مکان میں نہیں اترتے جس پر اہل مکہ نے قبضہ کر لیا تھا، بلکہ حضرت امّ ہانیؓ کے گھر اترتے ہیں، غسل کر کے چند رکعت نماز ادا کرتے ہیں، پھر کعبۃ اللہ تشریف لے جاتے ہیں، عثمان بن طلحہ کی طلبی ہوتی ہے، ہجرت سے پہلے آپؐ نے ایک دن کعبہ میں دو رکعت نماز ادا کرنی چاہی کہ مکہ سے جانے سے پہلے خدا کے گھر کی زمین پر جبین بندگی رکھنے کا شرف میسر آجائے، لیکن عثمان بن طلحہ نے درِ کعبہ کو کھولنے سے انکار کر دیا، اب وہی عثمان ایک مجرم کی طرح ہاتھوں میں کلیدِ کعبہ لیے سامنے کھڑے ہیں۔ آپؐ نے کعبہ کے دروازہ کھلوائے، اندر اور باہر کے حصے بتوں سے صاف کرائے، پھر کعبہ کے اندر دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ باہر کئی قریب وعزیز کلیدِ کعبہ کے طلب گار تھے، حضرت علی بھی اس کے لیے عرض کناں ہوئے، تاکہ بنوشیبہ کے بجائے بنو ہاشم کو کلید بردارِ کعبہ ہونے کا شرف حاصل ہو، لیکن آپؐ نے پھر کنجی عثمان بن طلحہ ہی کے سپرد کر دی اور ارشاد فرمایا: آج حسنِ سلوک اور وفا شعاری کا دن ہے، ألیوم یوم برّ و وفاء (۲)

مکہ کے لوگ ڈرے سہمے اور گھبرائے ہوئے تھے، اکثر موجود تھے، کچھ بھاگ چکے تھے، آپؐ نے کعبہ کے چوکھٹ پر کھڑے ہو کر ان سے دریافت کیا کہ آج تم ہم سے کیا امید رکھتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا: آپ ایک شریف بھائی اور شریف بھائی کی اولاد ہیں، اس مجمع میں وہ بھی تھے جو چلتے پھرتے آپ پر جملے کستے تھے، وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے قتل کے پروگرام بنائے تھے، وہ لوگ بھی تھے جو راہوں میں کانٹے بچھاتے تھے اور وہ لوگ بھی تھے جو مدینہ کی چھوٹی سی بستی کو ویران اور برباد کرنے کے لیے شب وروز سوچتے اور سازشوں کے تانے بانے بنتے تھے، لیکن آپؐ نے بیک زبان ان سب کو معافی کا پروانہ دے دیا، ان کو ان کے جرائم یاد تک نہیں دلائے اور ایک نگاہ خشمگیں کا وار تک کرنا مناسب نہ سمجھا، ابوسفیان نے جنگِ احد میں دشمنوں کی سپہ سالاری کی تھی، لیکن ان کو یہ اعزاز بخشا کہ اعلان فرمادیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوا وہ مامون ہوا، عکرمہ خود اسلام کے بدترین دشمن تھے اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کے بیٹے تھے، ڈر کر یمن کی سمت بھاگے، لیکن سمندری طوفان نے پھر مکہ واپس پہنچادیا، جب بیوی کی فرمائش پر ڈرتے گھبراتے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو انتقام تو کجا، آپؐ نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور مرحبا کہہ کر اپنے گلے سے لگایا اور کرم بالائے کرم یہ فرمایا کہ مسلمانوں سے کہا کہ وہ خواہ مخواہ ابوجہل کو برا بھلا کہنے اور کوسنے سے اجتناب کریں، یہ مناسب

(۱) البدایہ والنہایہ ۴/ ۲۹۳-۲۹۵ (۲) السیرۃ النبویۃ لابی الحسن علی الندوی ۱/ ۱۹۹

نہیں کہ ایک کافر باپ کی وجہ سے اس کے مسلمان بیٹے کو ایذا پہنچائی جائے۔(۱)

فتح مکہ کے اس تاریخی واقعہ سے مسلمانوں کو عفو و درگذر کا سبق ملتا ہے۔ کوئی قوم خواہ کتنی بھی مخالف و معاند ہو، لیکن جب قابو میں آجائے اور سر جھکا دے، تو پچھلے زخموں کو کریدنا اور درپئے انتقام ہونا بزدلی بھی ہے اور شرافتِ انسانی کے مغایر بھی۔ آپؐ نے اپنے چھوڑے ہوئے مکان میں اترنے سے گریز کیا، کیوں کہ اگر آپؐ ایسا کرتے، تو دوسرے مہاجرین بھی اپنے اپنے مکانوں پر قبضہ کرتے، اس سے ایک نئی آویزش شروع ہوتی اور اہل مکہ کے قلوب جو اسلام کے لیے نرم ہوئے تھے ان میں ضد اور عناد پیدا ہو جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس قوم کو آپ اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں، حتی المقدر ایسے اقدام سے گریز کریں جو ان کے لیے ضد و عناد پیدا ہونے کا باعث ہو۔ آپؐ نے عثمان بن طلحہ سے کنجی لے کر پھر انہی کو واپس کیا۔ اس میں یہ سبق ہے کہ اگر کسی تنظیم و ادارہ کے کسی شخص سے کوئی نامناسب بات ہو جائے، تو پھر حتی المقدور اسی کو ذمہ داری لوٹانے کی کوشش کی جائے کہ اس سے فتنہ اور انتشار سے حفاظت ہوتی ہے اور انسان باصلاحیت اور مفید لوگوں سے محروم نہیں ہوتا۔

☆☆☆

سیرتِ طیبہ کا ایک اہم واقعہ وہ ہے جو "واقعۂ افک" سے مشہور ہے۔ افک کے معنی جھوٹی تہمت کے ہیں۔ کچھ منافقین نے امّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگایا اور آپؓ کی پاکدامنی کو مشکوک کرنے کی کوشش کی۔ کچھ بھولے بھالے مسلمان بھی اس میں شریک ہو گئے، جن میں حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت مسطحؓ بن اثاثہ ہیں۔ بالآخر قرآن مجید میں حضرت عائشہؓ کی عفت و پاکدامنی کی بابت آیت نازل ہوئی اور تہمت لگانے والوں پر شرعی حد جاری ہوئی۔ ان سزا یافتہ لوگوں میں بارگاہِ رسالت کے شاعر حضرت حسانؓ بن ثابت بھی ہیں۔ یہ کوئی معمولی غلطی نہ تھی، پیغمبر کی بیوی اور خود اس پیغمبر کی عزت و آبرو کا مسئلہ اس سے متعلق تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہفتوں اس واقعہ کی تحقیق کے لیے پریشان رہے اور مدینہ میں ایک ہنگامہ خیز کیفیت رہی، لیکن ان سب کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو ایسا بھلایا کہ حضرت حسانؓ کو اپنے منبر اقدس پر بیٹھا کر ان سے اشعار سنے اور ان کو دعائیں دی۔ غور فرمایئے کہ کتنی وسیع القلبی اور فراخ دلی کی بات ہے، کہ ایسی زیادتیوں کو بھی آپ حرفِ غلط کی طرح بھلا دیتے تھے۔

☆☆☆

(۱) حیاۃ الصحابہ: ۱/۱۴۰، سیرۃ ابن ہشام: ۴/۴۱۰-۴۱۲، البدایۃ والنہایۃ: ۴/۳۰۰-۳۰۱

فلاحی ورفاہی کاموں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور تعلیمات

مولانا احتشام الحق قاسمی (علیگ)

خدمتِ خلق (Social Service) اور رفاہی و فلاحی کام (Relief And Welfare work) ہر زمانہ اور ہر سماج میں اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ آج تو ان کے نام پر ...تعداد تنظیمیں اور بیشمار ادارے قائم ہو چکے ہیں اور سیاسی جماعتیں تک عوامی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے انہی کاموں کا سہارا لیتی ہیں؛ لیکن حقیقی معنوں میں خدمتِ خلق اور فلاحی ورفاہی کام خال خال ہی نظر آتے ہیں، ورنہ اکثر ان کے پیچھے ریا اور عوامی مقبولیت کے حصول کا جذبہ پوشیدہ رہتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ دنیا میں انسانیت اور خلقِ خدا کی بھلائی سے متعلقہ جتنے اہم خیالات اور جتنے مفید تصورات گردش کر رہے ہیں، سب کے سب پیغمبروں اور رسولوں کی تعلیمات ہی سے اخذ کردہ ہیں، کہ ان ہی کے ذریعہ سے انسانوں تک بھلائی اور خیر کی باتیں پہنچی ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہر نبی اور ہر رسول اپنی جگہ پر سماجی مصلح اور مسیحا (Social Reformer) بھی ہوا کرتا ہے اور عام انسانوں کی بہ نسبت اس کو خلق خدا سے بہت زیادہ محبت ہوتی تھی، بلکہ نبوت کے عطا کیے جانے کی شرط ہی یہی ہے کہ اس چنندہ اور معزز شخصیت میں خلق خدا کی محبت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور تعلیمات کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ "خدمتِ خلق" کے انتہائی اونچے مقام پر فائز تھے، بلکہ آپ کی صحبت سے فیض یاب عام رفقاء تک اس میدان میں اپنی اپنی جگہ درخشاں ستارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

احساس ہوتا ہے کہ اگر موجودہ زمانہ میں بھی آپؐ کی مثال اور اس سلسلہ میں پیش کردہ ہدایات کو سامنے رکھ کر کام کیا جائے تو یقیناً ساری انسانی الجھن دور ہو جائیں، دنیا انسان کے لیے نمونۂ بہشت ہو جائے اور ایسا امن وامان قائم ہو کہ جس کا ہم تصور تک نہیں کر سکتے۔ درحقیقت یہ سیرتِ نبویؐ اور اسوۂ محمدی کا نہایت اہم پہلو ہے اور اسی پس منظر میں ہم "فلاحی ورفاہی کاموں اور خدمتِ خلق" سے تعلق رکھنے والے دوسرے مسائل کی بابت آپؐ کے اسوہ اور تعلیمات کا جائزہ لیں گے۔

رفاہِ عام کے لیے کنویں کھدوانا اور پانی کا انتظام کرنا

پانی انسانی زندگی کی اہم ترین ضرورتوں میں سے ایک ہے، اگر یہ دستیاب نہ ہو تو کاروبارِ زندگی بالکل ٹھپ پڑ جاتا ہے، بلکہ بسا اوقات زندگی کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی شدید پیاس کی حالت میں اس کو پانی پلانے کو اسے زندگی بخشنے کے مترادف قرار دیا۔ ارشادِ نبویؐ ہے: "جس نے کسی ایسی جگہ جہاں پانی نہیں ملتا تھا کسی مسلمان کو پانی پلایا، گویا کہ اس نے کسی کو زندہ کر دیا۔" (ابن ماجہ، باب المسلمون شرکاء فی ثلاث /۸/۱۷۸، طبع دیوبند)

پانی کی اسی اہمیت کے پیش نظر آپؐ نے کنویں کھدوانے اور نہریں جاری کرنے کو صدقۂ جاریہ قرار دیا کہ جب تک لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے، پیاسوں کی پیاس بجھتی رہے گی، اس وقت تک اس شخص کو ثواب ملتا رہے گا، چاہے وہ مر ہی کیوں نہ چکا ہو۔ اسی طرح آپؐ نے کسی مرحوم شخصیت کے ایصالِ ثواب کی خاطر کنویں کھدوانے کو بہترین صدقہ قرار دیا ہے۔ حدیث مبارک ہے:

" عن سعد بن عبادة قال يا رسول الله أن امّ سعد ماتت ، فأيّ الصدقة أفضل ؟ قال : الماء ؛ فحفر بئرا و قال هذه لامّ سعد . " (ابوداؤد شریف ۱/۲۳۶، طبع دیوبند)

"حضرت سعدؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے (ان کے ایصالِ ثواب کے لیے) کونسا صدقہ زیادہ افضل ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانی سب سے افضل ہے؛ چنانچہ حضرت سعدؓ نے ایک کنواں کھدوایا اور کہا یہ میری ماں (کے ایصالِ ثواب) کے لیے ہے۔"

ایک اور حدیث ہے:

" عن أبي هريرةؓ قال قال رسول الله إذا مات الانسان انقطع عنه عمله إلا من ثلثة : صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له . "(مسلم شریف ۲/۴۱، طبع دیوبند)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمی مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا ثواب ختم ہو جاتا ہے، مگر تین چیزیں ایسی ہیں جن کا ثواب مرنے کے

بھی ملتا رہتا ہے، ایک صدقۂ جاریہ، دوسرے وہ علم جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا رہے، تیسرے اولادِ
لح، جو اس کے مرنے کے بعد اس کے لیے دعا کرتی رہے۔

اہل علم نے "صدقۂ جاریہ" میں کئی چیزوں کو شامل کیا ہے، مگر خاص طور پر کنویں کھدوانے
ل دار یا سایہ دار درخت لگوانے اور مذہبی کتابیں اہل علم کے لیے وقف کرنے کا ذکر کیا ہے کہ
ب تک ان چیزوں سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا رہے گا اس وقت تک ثواب ملتا رہے گا۔

ں کی حفاظت کے لیے آپؐ کے اقدامات

آپؐ نے کنوؤں کے کھدوانے اور لوگوں کے لیے پانی فراہم کرنے پر ہی زور نہیں دیا بلکہ پانی
حتیاط و کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کرنے کی بھی ہدایت کی۔ ارشادِ نبویؐ ہے: "اگر تم میں سے
ی پانی کی نہر پر بھی کھڑا ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ فضول خرچی سے اجتناب کرے۔" (ابن ماجہ / ۳۴،
ر دیوبند)

اس کے علاوہ آپ نے پانی کے "ذخیرہ" کی حفاظت اور اس کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے پر بھی
حد زور دیا اور کسی بھی ایسے عمل سے اجتناب کی سخت تاکید کی جس سے کہ پانی میں کسی طرح کی
ی آلودگی پیدا ہوتی ہو۔ ارشادِ نبویؐ ہے: "تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے پانی (جو جاری نہ ہو) میں
ز پیشاب نہ کرے۔" (بخاری شریف، باب البول فی الماء الراکد ۱ / ۳۷)

ایک اور موقع ارشاد فرمایا: "تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل نہ کرے جبکہ وہ
ں ہو۔ لوگوں نے (راویِ حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے) پوچھا کہ اے ابوہریرہؓ پھر وہ کیا کرے؟
ں نے فرمایا: اس میں سے علاحدہ نکال کر غسل کرے۔ (مسلم شریف ۱ / ۱۳۸، باب النہی عن
ں فی الماء الراکد)

روں میں صفائی کے لیے اقدامات

عہدِ نبویؐ میں یہودیوں کا طریقہ تھا کہ وہ کچرا اور جانوروں کا فضلہ، گوبر وغیرہ اپنے گھر کے
ازوں کے سامنے ڈال دیا کرتے تھے، جس سے آنے جانے والوں کو تکلیف ہوا کرتی تھی۔ آپؐ
صحابۂ کرامؓ کو اس طرح کرنے سے سخت منع فرمایا اور صفائی ستھرائی کو اختیار کرنے پر زور دیا۔
ادِ نبوی ہے: "نَظِّفُوْا أَفْنِيَتَكُمْ"، "تم اپنے گھر کے صحنوں کو صاف ستھرا رکھا کرو" (ترمذی
یف، باب ماجاء فی النظافۃ ۱ / ۱۰۷)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ نَظِیْفٌ یُحِبُّ النَّظَافَۃَ ۔ "(بیشک اللہ تعالیٰ صاف ستھرے ہیں اور صفائی ستھرائی کو پسند کرتے ہیں۔ (الدر المنتثرة فی الأحادیث المشتهرة ، مؤلفه سیوطیؒ / ٦٠ ، طبع عیسی الحلبی مصر)

رفاہِ عام کے لیے شجر کاری کی ترغیب

ہرے بھرے درخت، سرسبز و شاداب کھیتیاں اور پودے و کیاریاں جہاں ماحول کو خوشنما اور دلفریب بناتے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، وہیں ماحول کی آلودگی کو دور کرنے، فضاء کو پاکیزہ کرنے اور ہم کو مطلوبہ صاف و پاکیزہ ہوا مہیا کرنے میں بھی زبردست معاون ہیں اور یہی نہیں بلکہ ہماری "اغذیہ" کا تقریباً دو تہائی کوٹہ انہی درختوں، کھیتوں اور پودوں سے پورا ہوتا ہے اور نہ صرف انسان بلکہ چرند و پرند بھی اپنی بیشتر غذائی و رہائشی ضروریات انہی سے پوری کرتے ہیں۔ ان کی اسی اہمیت کی بنا پر آج بھی "شجر کاری" کو "خدمتِ خلق" کا ایک اہم حصہ تصور کیا جاتا ہے، حکومتیں بڑے پیمانہ پر روپیہ پیسہ خرچ کر کے درخت لگواتی ہیں، ہریالی اور سبزہ اُگواتی ہے؛ مگر چند دنوں بعد حکومتوں کے تبدیل ہونے اور صحیح توجہ نہ ملنے کے باعث سب تہس نہس ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف آپ ﷺ نے لوگوں میں خود اپنی طرف سے اس طرح کے کاموں میں حصہ لینے کی تحریک پیدا کی اور اس کو کارِ ثواب قرار دیا۔ ارشادِ نبوی ہے:

"مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَغْرِسُ غَرْسًا أَوْ یَزْرَعُ زَرْعًا فَیَأْکُلُ مِنْهُ اِنْسَانٌ أَوْ طَیْرٌ أَوْ بَهِیْمَةٌ اِلا کَانَتْ لَهُ صَدَقَةٌ"

(جو کوئی مسلمان کوئی درخت لگائے یا کھیتی کرے، پھر کوئی پرندہ یا چوپایہ اس درخت یا کھیتی میں سے کھائے تو یہ اس بندے کی طرف سے صدقہ اور کارِ ثواب ہوگا۔)

عوامی مقامات کو آلودگی سے بچانا

راستے، سڑک، سایہ دار درخت اور عام طور پر لوگوں کے اٹھنے بیٹھنے کی جگہوں کو آلودہ کرنے سے آپ ﷺ نے اجتناب کی تاکید فرمائی؛ اس لیے کہ ان سے عمومی فائدہ متعلق ہوتا ہے اور ایک شخص کی ناشائستہ حرکت سے اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایسی جگہوں پر پیشاب، پاخانہ کرنے، یا دیگر طریقوں سے ان کو آلودہ کرنے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: "اِتَّقُوا اللَّاعِنَیْنِ" (لعنت کے دو اسباب سے بچو) لوگوں نے عرض کیا: وہ دو سببِ لعنت کیا ہیں؟ فرمایا: لوگوں کے راستہ

میں یا ان کے سایہ حاصل کرنے کی جگہوں پر پیشاب پاخانہ کرنا" (ابوداؤد شریف، باب المواضع التی نہی عن البول ۱/۵)

راستوں کے استعمال کے سلسلہ میں احتیاط کی تاکید

جہاں آپؐ نے عوامی راستوں پر کوئی ایسی شئ ڈالنے سے منع فرمایا جو کہ لوگوں کے لیے تکلیف کا سبب ہو، وہیں راستہ میں پہلے سے موجود تکلیف دِہ شئ کو فوراً دور کرنے کی بھی تاکید کی اور اس کو ایمان کا ادنیٰ درجہ قرار دیا۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

" الایمان بضع وّ سبعون أو بضع و ستون شعبة ، فأفضلها قول " لا الله الا الله ، و أدناها إماطة الأذیٰ عن الطریق . "

(ایمان کے ستر سے زائد یا ساٹھ سے زائد (راوی کے شک کے مطابق) درجات ہیں، ان میں سے سب سے افضل "لا الٰہ الا اللہ" کا اقرار ہے اور سب سے ادنیٰ راستہ کی تکلیف دِہ شئ کو ہٹانا۔" (مسلم شریف ۱/۴۷، طبع دیوبند)

ارشاد ہے: "إیاکم و الجلوس علی الطرقات" (تم پر لازم ہے کہ تم راستوں میں بیٹھنے سے احتراز کرو۔)

آپؐ نے مسلمانوں کو راستوں پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے؛ البتہ کسی غرضِ صحیح کے لیے کچھ شرائط کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت بھی دی ہے۔ وہ شرائط یہ ہیں:

" غَضُّ الْبَصَرِ ، كَفُّ الأذیٰ ، رَدُّ السَّلامِ ، وَ الأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ ، وَ النَّهْیُ عَنِ الْمُنْكَرِ . "

"نگاہیں نیچی رکھی جائیں، کسی کو ایذاء دینے سے احتیاط برتی جائے، (سلام کرنے والے کے) سلام کا جواب دیا جائے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیا جائے۔"

اگر ان شرائط کا پاس و لحاظ رکھا جائے تو کسی صحیح ضرورت کی بنا پر راستوں کے پاس بیٹھنا جائز ہے، ورنہ نہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہ شرائط اتنی سخت ہیں کہ بے مقصد یا غلط مقصد سے بیٹھنے والا اس کا لحاظ کر ہی نہیں سکتا، اس لیے اس کو وہاں بیٹھنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔

مساعی برائے انسدادِ بے رحمیِ جانوراں

دیگر اقوام نے جانوروں پر ڈھائے جانے والے مظالم کو دور کرنے کے لیے اور ان پر روک

لگانے کے لیے اب جاکر کچھ سوچا ہے، ادھر سو سال کے اندر ہی یورپ کے کچھ لوگوں میں یہ شعور پیدا ہوا ہے، لیکن اس میں بھی وہ ایسی افراط و تفریط کا شکار ہوئے کہ جانوروں کو انسانوں پر فوقیت دینے لگے، جب کہ آپؐ نے آج سے چودہ سو سال قبل ہی اس کی طرف توجہ فرمائی تھی اور لوگوں کو واضح انداز میں سمجھادیا تھا کہ جانوروں کے معاملہ میں بھی خدا سے ڈرا جائے، ان کی غذا اور صحت کا خیال رکھا جائے، ان کو ایذا رسانی اور تکلیف دہی سے سخت اجتناب کیا جائے۔ حدیث نبویؐ ہے:

”عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَأَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِمَارًا قَدْ وُسِمَ فِي وَجْهِهِ فَقَالَ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ فَعَلَ هٰذَا . “

(حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک گدھے پر نظر پڑی جس کے چہرے پر داغ کر نشان بنایا گیا تھا۔ آپؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا: وہ شخص خدا کی رحمت سے محروم ہے جس نے یہ (بے رحمی کا) کام کیا ہے۔ (مسلم شریف ۲/ ۲۰۲، طبع دیوبند)

دنیا کے مختلف علاقوں میں گھوڑوں، گدھوں اور گائے بیل وغیرہ کو اپنی ملکیت ظاہر کرنے کے لیے اپنا اپنا مخصوص نشان اپنے جانوروں کے جسم پر داغا کرتے تھے اور اب بھی کچھ جگہوں پر اس کا رواج ہے، مگر ”چہرہ“ جو کہ سب سے اہم اور نازک عضو ہے، اس پر اس طرح کی بے رحمی کا مظاہرہ کرنا، آپؐ کے دل کو دُکھا گیا اور آپؐ نے اپنے سخت دُکھ کا اس طرح اظہار کیا۔ ظاہر ہے کہ اس بیزاری کا اظہار صرف ایک معمولی گدھے کے ساتھ بد سلوکی کی بناء پر ہوا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ”گدھے“ جیسے معمولی جانور کے ساتھ ”بے رحمی“ بھی انسان کے لیے لعنت کا سبب ہے۔

ایک اور حدیث ہے: حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے صاحبزادے عبد الرحمٰن اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپؐ قضاءِ حاجت کے لیے تشریف لے گئے، اس دوران ہماری نظر ایک چھوٹی سی سرخ چڑیا پر پڑی، جس کے ساتھ دو چھوٹے بچے بھی تھے، ہم نے بچوں کو پکڑ لیا، وہ چڑیا ہمارے سروں پر منڈلانے لگی، آپؐ واپس آئے اور (اس چڑیا کو دیکھ کر) دریافت فرمایا: کس نے اس کے بچوں کو پکڑ کر ستایا ہے؟ اس کو اس کے بچے فوراً لوٹا دو۔ اسی طرح آپؐ کی چیونٹیوں کے بہت سارے بلوں پر جو کہ یکجا تھے نظر پڑی، ہم نے وہاں آگ لگادی تھی، آپؐ نے دریافت فرمایا: ان کو آگ سے کس نے جلایا؟ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم ہی نے یہ آگ لگائی ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا: آگ کے پیدا کرنے والے خدا کے سوا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی جاندار کو آگ کا عذاب دے۔ (ابو داؤد)

جانوروں کی غذااور صحت کاخیال رکھنے کی تاکید

آپؐ نے لوگوں کواس بات کی بھی سخت ہدایت فرمائی تھی کہ جن جانوروں کو تم استعمال کرتے ہو، ان کی صحت اور غذا کی خوب نگہداشت کیا کرو، ایسانہ ہو کہ وہ بھوکے اور کمزور ہوں اور تم ان سے مشقت و محنت کے کام لیتے رہو۔ حدیث مبارکہ ہے :

مَرَّ النَّبِیُّ ﷺ بِبَعِیْرٍ قَدْ لَحِقَ ظَهْرُهُ بِبَطْنِهِ فَقَالَ : اتَّقُوْا اللّٰهَ فِیْ هٰذِهِ الْبَهَائِمِ الْمُعْجَمَةِ ، فَارْكَبُوْهُ صَالِحَةً وَ اتْرُكُوْهَا صَالِحَةً ۔ "(ابوداؤد)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک اونٹ کے پاس گذرے جس کا پیٹ (بھوک کی وجہ سے) کمر سے لگ گیا تھا۔ آپؐ نے اسے دیکھ کر فرمایا : لوگو! ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو (ان کو اس طرح بھوکا نہ مارو) ان پر سوار ہو تو ایسی حالت میں جب یہ ٹھیک ہوں (ان کا پیٹ بھرا ہوا ہو) اور ان کو چھوڑو تو (اسی طرح کھلا پلا کر) اچھی حالت میں چھوڑو۔"

اسی حدیث سے مشابہ ابوداؤد شریف ہی میں ایک اور حدیث ہے کہ : حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انصار میں سے کسی کے باغ میں تشریف لے گئے۔ وہاں پر ایک اونٹ تھا، جو آپ کو دیکھ کر بلبلایا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آپؐ اس کے پاس آئے اور اس کی گردن کے اوپری حصہ کو شفقت سے سہلایا۔ جب وہ خاموش ہوا تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ اس کا مالک کون ہے ؟ ایک انصاری نوجوانؓ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ میرا اونٹ ہے۔ آپؐ نے فرمایا : اس بے چارے بے زبان جانور کے بارے میں تم اللہ سے نہیں ڈرتے جس نے تم کو اس کا مالک بنایا ہے ؟ اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور زیادہ کام لے کر اس کو تکلیف پہنچاتے ہو۔

بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ ایک بدکردار عورت کو صرف اس بناء پر مغفرت مل گئی کہ اس نے ایک پیاس سے تڑپتے ہوئے کتے کو پانی پلاکر زندگی بچائی تھی اور ایک عورت کو صرف اس بناء پر جہنم کی مستحق ہونا پڑا کہ اس نے بلی پال رکھی تھی اور اس کو باندھ کر رکھتی تھی، کھانے پینے کو کچھ نہ دیتی اور اسی عالم میں وہ بلی مر گئی۔

آپؐ نے جانوروں سے صحیح سلوک کے سلسلہ میں براہِ راست ہدایات دے کر اور اس طرح کے واقعات سنا کر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اس معاملہ میں زبردست تربیت فرمائی تھی ؛ چنانچہ نبوی تعلیمات کے عام ہونے سے جہاں انسانوں کو سکھ چین کی زندگی نصیب ہوئی وہیں جانوروں اور پرندوں کے لیے بھی سکون واطمینان کے راستے کھلے۔

جنوں کی غذاؤں کو آلودہ نہ کرنے کی ہدایات

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ خلق اور فلاحی و رفاہی کاموں کا دائرہ صرف انسانوں اور جانوروں ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ اس میں اجنہ کے لیے بھی مساعی داخل تھیں۔ ویسے آپ کا عمومی حکم ہے کہ کسی بھی جاندار کی غذاء کو آلودہ نہ کیا جائے، مگر اجنہ کے لیے آپؐ نے بطور خاص انسانوں کو ہدایت فرمائی۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جب جنوں کا وفد آپؐ کی خدمت میں ایمان لانے کے لیے حاضر ہوا تو انہوں نے درخواست کی: "اپنی امت کو ہڈی، لید اور کوئلہ سے استنجاء منع کر دیجیے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمارا رزق بنایا ہے۔"؛ چنانچہ آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کو منع فرمادیا۔ (ابو داؤد ، باب ما ینھی ان یستنجی به ۵/۱)

شارحین حدیث کہتے ہیں کہ ہڈی اور کوئلہ جنات کی غذا ہے، جب کہ "لید" ان کے جانوروں کی غذا ہے؛ اس لیے ان کو آلودہ کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ (مرقات المفاتیح ۱/۶۸ ، اشعة اللمعات ۱/۲۱۰)

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں مبعوث ہوئے اس وقت نہ صرف عربوں بلکہ سارے عالم میں غلاموں کا طبقہ موجود تھا، مفتوح قوموں کو فاتح قومیں غلام بنالیا کرتی تھیں، ان سے جانوروں کی طرح محنت و مشقت کا کام لیا جاتا تھا، ان کی خرید و فروخت کی جاتی، غرض ان کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر ہوتی تھی۔

آپؐ نے اس طرزِ عمل کو بتدریج ختم کیا اور لوگوں کو احساس دلایا کہ غلام بھی تمہارے بھائی ہیں اور تمہارے اچھے سلوک کے مستحق ہیں، ان کی صحیح غذا، کپڑے اور صحت کی ذمہ داری ان کے آقاؤں پر لازم ہوتی ہے اور جو شخص ان پر زیادتی کرے گا وہ قیامت کے دن اس سلسلہ میں جوابدہ ہوگا۔

آپ کا ارشاد ہے:

" إِخوانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيكُمْ فَمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ اَخَاهُ تَحْتَ يَدَيْهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ وَ لَا يُكَلِّفْهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا يَغْلِبُهُ اِنْ كَلَّفَهُ مَا يَغْلِبُهُ فَلْيُعِنْهُ عَلَيْهِ ." (بخاری و مسلم)

"یہ بیچارے غلام) تمہارے بھائی ہیں، اللہ نے ان کو تمہارا زیر دست (محکوم) بنادیا ہے، تو
لند جس کے زیر دست اس کے بھائی کو کردے، اس کو چاہیے کہ اپنے غلام کو وہی کھلائے جو خود کھاتا
ہے اور وہ پہنائے جو خود پہنتا ہے اور اس کو ایسے کام پر مجبور نہ کرے جو اس کے لیے بھاری ہو اور اگر
یساکام کروائے تو اس میں خود بھی اس کی مدد کرے۔"

کچھ فرق کے ساتھ اسی مضمون کی کئی اور احادیث غلاموں کے حقوق کے سلسلہ میں وارد
ئی ہیں۔

غلاموں کی خطاؤں اور لغزشوں سے در گزر کرنے، ان کو معاف کرنے کے بارے میں
سنن ابی داؤد" کی حدیث ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ خدمتِ اقدسؐ میں موجود تھے کہ ایک
ص حاضر ہوا اور پوچھا: یارسول اللہ! اپنے خادم اور غلام کی غلطیاں ہمیں کس حد تک معاف کر دینا
ہیے؟ آپؐ نے سکوت فرمایا اور کوئی جواب نہیں، اس شخص نے پھر پوچھا، آپؐ اب بھی خاموش
ہے، اس نے تیسری مرتبہ استفسار کیا تو ارشاد فرمایا: ہر دن ستر مرتبہ۔

آپؐ نے صحابہؓ کرام کو اس بات کی تاکید فرمائی کہ غلاموں پر ظلم و ستم سے باز رہو، ورنہ اس
سلہ میں تم سے آخرت میں باز پرس ہو گی۔ ارشادِ نبوی ہے:

"مَنْ ضَرَبَ مَمْلُوْكًا ظَالِمًا اُقِيْدَ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ." (بیہقی شعب الایمان)

"جو کوئی اپنے غلام کو ناحق مارے گا قیامت کے دن اس سے بدلہ لیا جائے گا۔"

آپؐ کی انہی تعلیمات کے نتیجہ میں مسلم سماج سے متعلقہ غلاموں کی زندگی ہی بدل گئی، ان
لیے ترقی کے مواقع نکلے، آزادانہ طور پر کام کرنے کا ماحول بنا؛ چنانچہ بعد میں ان میں سے بہت
بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، ائمہ تیار ہوئے اور بعضوں نے تو حکومتیں بھی کیں۔

می کے خاتمہ کے لیے آپؐ کی مساعی

آپؐ نے مستقل طور پر ایسی تدابیر اختیار فرمائیں اور ایسے اصول متعین فرمائے کہ جن سے
سے غلامی کا خاتمہ ممکن ہو سکے۔ آپؐ نے اصول مقرر فرمایا کہ جو باندی اپنے آقا کے بچہ کی ماں بن
ئے وہ آزاد عورت ہی کی طرح ہے، اس سے جو بچے پیدا ہوں گے وہ آزاد ہی ہوں گے، نیز مختلف
ہوں کے جو کفارے آپؐ نے مقرر فرمائے، ان میں بھی اوّل مرحلہ پر غلاموں ہی کو آزاد کرنے
کید فرمائی؛ چنانچہ روزہ کا کفارہ، قتل کا کفارہ، جھوٹی قسم کا کفارہ ان سب میں غلاموں کا آزاد کرنا ہی
ادائیگی کے لیے اہم قرار دیا گیا۔

دوسری جانب آپؐ نے لوگوں کے سامنے غلاموں کو آزاد کرنے کی فضیلت اور اس سے حاصل ہونے والے ثواب کو اس پرکشش انداز میں پیش کیا کہ لوگوں میں ''غلاموں'' کو آزاد کرنے کا زبردست ذوق و شوق عام ہوا؛ چنانچہ صرف چند صحابہؓ حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عمر بن عوف اور ابو بکر صدیقؓ نے فی سبیل اللہ سینکڑوں اور ہزاروں غلاموں کو آزاد کیا۔ آپؐ کی انہی مساعی حسنہ کا نتیجہ ہے کہ ہزاروں سال سے مروّج غلامی کا سلسلہ دنیا سے ختم سکا۔

انسانیت کی تعلیم

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی لوگوں میں انسانیت پیدا کرنے اور ان کو انسانیت کے اصل پیغام یعنی سب ہی معبودِ حقیقی کے بندے ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت نہیں، صرف اعلیٰ کردار ہی فوقیت و برتری کا سبب ہے، سمجھانے میں گذری۔

آپؐ نے نہایت ہی جامع الفاظ میں انسانوں سے حسنِ سلوک کی کس طرح تعلیم فرمائی، وہ ہم کو حضرت معاذ بن جبلؓ کی اس حدیث میں نظر آتا ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپؐ سے ایمان کے سب سے افضل درجہ کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپؐ نے فرمایا:

" أنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَ تَكْرَهُ لَهُمْ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ . "(رواہ احمد)

''تم لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو اور ان کے لیے وہی ناپسند کرو جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو۔''

ایک اور جگہ انسانیت اور انسانوں سے محبت کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ ، فَأَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ أَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ رواہ البیھقی . "(مشکوٰۃ شریف / ۴۲۵)

''مخلوق خدا کا کنبہ ہے، لہٰذا خدا کے نزدیک مخلوق میں کا بہترین وہ شخص ہے جو خدا کے کنبہ کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرے۔''

بھلائی اور برائی دونوں کے بدلے اچھا سلوک

فطرتِ انسانی ہے کہ بھلائی کا بدلہ بھلائی سے اور برائی کا برائی سے دیا جائے؛ اس لیے اگر کوئی ہمارے ساتھ اچھا کرے تو ہم اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں، یہ کوئی کمال کی بات نہیں، کمال تو یہ ہے کہ کوئی ہمارے ساتھ ناروا سلوک اپنائے اور ہم اس کے ساتھ مشفقانہ اور دوستانہ برتاؤ کریں۔

آقائے نامدار محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کو بلکہ ساری دنیا کو اسی کا پیغام دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

" لَا تَكُوْنُوْا إِمَّعَةً تَقُوْلُوْنَ إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَ اِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا وَ لٰكِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَ إِنْ أَسَاؤُا فَلَا تَظْلِمُوْا . " (رواہ الترمذی)

(تم دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرنے والے نہ بنو، کہ کہنے لگو اگر اور لوگ احسان کریں تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر دوسرے لوگ ظلم کا رویہ اختیار کریں گے تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے: بلکہ اپنے دلوں کو اس پر پکا کرو کہ اگر لوگ احسان کریں تب بھی احسان کرو، اور اگر لوگ برا سلوک کریں تب بھی ظلم اور برائی کا رویہ اختیار نہ کرو۔)

اسی مضمون کو شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے

بدی را بدی سهل باشد جزاء　　　اگر مردی احسن إلى من أساء

(کہ برائی کے بدلہ برائی تو بہت آسان معاملہ ہے، اگر مرد ہو تو برائی کے بدلہ اچھائی کا سلوک رکھو۔)

یتیموں اور بیواؤں کی مدد اور تعاون

یتیم بچے اور بیوہ عورتیں سماج کے کمزور افراد میں شمال ہوتے ہیں، اکثر اوقات مال و دولت اور طاقت کے سہارے دونوں سے وہ محروم ہوتے ہیں؛ چنانچہ عام طور پر ان کے ساتھ ناروا سلوک رکھا جاتا ہے، ان کو میراث سے محروم کیا جاتا ہے، ان کے مالوں کو غصب کیا جاتا ہے؛ اس لیے آپؐ نے اس طرف بطورِ خاص توجہ فرمائی اور ان کی معمولی سی مدد کے عوض میں جنت کی بشارت تک کی نوید سنائی۔ فرماتے ہیں :

" اَلسَّاعِيْ عَلَى الْأَرْمِلَةِ وَ الْمِسْكِيْنِ كَالْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ . " (رواہ البخاری و المسلم کذا فی المشکوۃ /۴۲۱)

"بیواؤں اور مسکینوں کے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا بندہ (اللہ کے نزدیک اجر و ثواب میں) راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

"مَنْ قَبَضَ يَتِيْماً بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلٰى طَعَامِهٖ وَ شَرَابِهٖ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ اَلْبَتَّةَ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ قَدْ عَمِلَ ذَنْباً لَا يُغْفَرُ . " (رواہ الترمذی ہکذا فی المشکوۃ / ۴۲۳)

"اللہ کے جس بندے نے مسلمانوں میں سے کسی یتیم بچہ کو لے لیا اور اپنے کھانے پینے میں شریک کر لیا، تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور بالضرور جنت میں داخل کرے گا، الا یہ کہ اس نے کوئی ایسا جرم کیا جو کہ نا قابل معافی ہو۔"

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

من مسح رأس يتيم لم يمسحه إلا لله كان له بكلّ شعرة يمدّ عليها يده حسنات و من أحسن إلى يتيمةٍ أوْ يتيم عنده كنت أنا و هو في الجنة كهاتين و قرن بين اصبعيه . (رواہ احمد والترمذی)

"جس شخص نے کسی یتیم کے سر پر صرف اللہ کے لیے ہاتھ پھیرا تو سر کے جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرا تو ہر بال کے حساب سے اس کی نیکیاں ثابت ہوں گی اور جس نے اپنے پاس رہنے والی کسی یتیم بچی یا یتیم بچہ کے ساتھ بہتر سلوک کیا تو میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیوں کو ملا کر دکھایا۔"

جس طرح آپؐ نے یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک پر بشارتیں سنائیں ویسے ہی ان کے ساتھ بدسلوکی پر وعیدیں بھی سنائیں ؛ چنانچہ ایسے گھر کو جس میں کسی یتیم کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہو، سب سے بدتر گھر قرار دیا۔ فرماتے:

" خير بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يحسن إليه و شر بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يساءُ إليه . "(رواہ ابن ماجہ، مشکوٰۃ / ۴۲۳)

"مسلمانوں کے گھروں میں سب سے بہتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کیساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو اور سب سے بدتر گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ برا سلوک روا رکھا جاتا ہو۔"

پریشان حالوں کی مدد کی ترغیب

آپؐ نے جہاں سماج کے مخصوص لوگوں کی نشاندہی فرما کر ان کا نام لے کر بتایا کہ ان کی مدد کرنا اور ان کا سہارا بننا اخروی ثواب کا باعث ہے، وہیں ہر اس شخص کی مدد کرنے اور اس کی مشکل دور کرنے کی تاکید فرمائی جو پریشان حال ہو، یا خوش حال ہو مگر اچانک اس پر کوئی مصیبت آئی ہو اور اس کے بدلہ میں بھی اخروی خوشخبریوں کی خبر دی۔ فرماتے ہیں:

" المسلم أخو المسلم لا يظلمه و لا يسلمه و من كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته و من فرج عن مسلم كربة ، فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيامة و من

ستر مسلما ستره الله يوم القيامة . " (متفق علیہ)

(ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے (اس لیے) نہ تو خود اس پر زیادتی کرے اور نہ دوسرے کا مظلوم بننے کے لیے اس کو بے یار و مددگار چھوڑے اور جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی کرے گا اور جو کسی مسلمان کی تکلیف اور مصیبت دور کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے اس کی کسی مصیبت کو دور کرے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی پردہ داری کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ داری کرے گا۔)

بڑے بوڑھوں کا احترام اور ان کی مدد

آج سارے عالم کا انسانی معاشرہ خطرناک حد تک بگڑ چکا ہے، خاندانی نظام کے بکھرنے کے نتیجہ میں عمر رسیدہ اور بوڑھے لوگوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے، یورپ میں تو بوڑھے اور عمر رسیدہ لوگوں کی حیثیت ایک عضو معطل کی سی ہو کر رہ گئی ہے، یہی حال ہندوستان اور اس طرح کے ملکوں کے بڑے شہروں اور کاروباری قسم کے مغرب زدہ لوگوں کا ہے۔ مغربی ممالک میں عمر رسیدہ لوگوں کے لیے مختلف قسم کے "ہوسٹل" اور قیام گاہوں کا انتظام ہے، چنانچہ بڑے بزرگوں کو بجائے گھروں میں آرام و آسائش کے ساتھ رکھنے اور ان کو بڑھاپے کی عمر میں آرام دینے کے اس قسم کے اداروں میں داخل کر دیا جاتا ہے، جہاں کچھ رقم کے ادا کیے جانے پر ان کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام کیا جاتا ہے ؛ چنانچہ اس قسم کے اداروں میں وہ اکیلی اور گھٹی ہوئی بے کیف زندگی گذارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آپؐ نے معاشرہ کے ہر کمزور پہلو پر توجہ دی ہے، چنانچہ ان کے سلسلہ میں بھی آپؐ کے ارشادات نہایت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ سب سے پہلے تو آپؐ نے ماں باپ اور خاندان کے دیگر بزرگوں کی نگہداشت اور خدمت کو زبردست کارِ ثواب قرار دیا اور ان کی خوشنودی کو اللہ کی خوشنودی قرار دیا، اسی طرح ان کی ناراضگی کو اللہ کی ناراضگی قرار دیا، یعنی ان کی ناراضگی میں اس کی آخرت خطرہ سے دوچار ہو گی، دوسری طرف آپ نے مجموعی طور پر ایسے بزرگوں کی بھی خدمت اور تکریم و تعظیم کی تاکید کی جن سے کوئی تعلق نہ ہو اور ہدایت فرمایا کہ آج نوجوانی کی حالت میں تم اگر کسی بوڑھے شخص کی تعظیم کرتے ہو تو کل تمہارے بڑھاپے کی حالت میں کوئی اور تمہارے ساتھ تعظیم کا سلوک کرے گا۔ ارشاد فرماتے ہیں :

" ما أكرم شاب شيخا من أجل سنه إلا قيضه الله له عند سنه من يكرمه . " (رواہ ترمذی، مشکوۃ/۴۲۵)

"جو بھی نوجوان کسی بوڑھے شخص کی اس کے بڑھاپے کے سبب تعظیم و تکریم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بڑھاپے کے وقت کسی ایسے شخص کو متعین کر دیتا ہے جو اس کی تعظیم و تکریم کرتا ہے۔"

ایک اور جگہ بوڑھوں کی تعظیم کو اللہ جلّ جلالہ کی تعظیم سے مشابہ قرار دیا۔ فرماتے ہیں :

" إن من اجلال اللّٰہ اکرام ذی الشیبة المسلم ." (مشکوٰۃ / ۴۲۳)

"بوڑھے مسلمان کی عزت و توقیر کرنا من جملہ اللہ کی تعظیم کے ہے۔"

پڑوسیوں کے حسن سلوک کی تاکید

خدمتِ خلق کے خاکہ میں آپؐ نے خصوصی مستحقین اور عمومی مستحقین کا واضح تصور پیش کیا، چنانچہ خصوصی مستحقین کی آپؐ نے جو نشاندہی فرمائی اس میں سرفہرست لوگوں میں پڑوسی داخل ہیں ۔ان کے ساتھ صحیح سلوک اختیار کرنے اور ان کے ساتھ مصیبت میں کام آنے کی آپؐ نے تاکید فرمائی اور اس عمل کو ایمان کا جزء قرار دیا۔ فرماتے ہیں :

" من کان یؤمن باللّٰہ فلیکرم جارہ ."

(جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس پر لازم ہے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرے۔)

آپؐ نے اس بات پر تنبیہ فرمائی کہ پڑوسیوں کے ساتھ بد سلوکی اور ان کو ایذا رسانی آدمی کو جنت سے دور کر دیتی ہے۔ فرماتے ہیں :

" لایدخل الجنة من لا یأمن جارہ بوائقه ." (رواہ مسلم)

(وہ آدمی جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی مامون نہ ہو۔)

آپؐ نے اس بات کو ایمان کی عدم تکمیل کی علامت قرار دیا کہ کوئی آدمی اس بات کے علم کے باوجود کے اس کا پڑوسی بھوکا ہے خود اپنا پیٹ بھر کر سوتا رہے، اسی طرح آپؐ نے اس کی بھی ہدایت فرمائی کہ اپنے گھر کی تعمیر میں دیواریں اس طرح نہ اٹھاؤ کہ پڑوسی کے گھر کی ہوا بند ہو جائے اور اس کو تکلیف پہنچے اور گھر میں جب کوئی اچھی یا مرغوب چیز پکے تو پڑوسی کو نہ بھولو، یا تو اس کے پاس اس میں سے کچھ پہنچا دو، یا پھر اس کی مہک کو اس کے گھر تک نہ پہنچنے دو، کہ اس کے بچوں کے دل میں اس کی طمع پیدا ہو۔

پس ماندہ لوگوں کی تعلیم سر بر آوردہ لوگوں کی ذمہ داری

آج سارا زمانہ تعلیم کی اہمیت کو اچھی طرح جان چکا ہے۔اگر کسی قوم یا انسان کو اوپر اٹھانا ہے، اس کی پسماندگی اور بے تہذیبی کو دور کر کے اسے سماج میں ایک باوقار مقام عطا کرنا ہے تو تعلیم ہی واحد شیٔ ہے جس سے یہ کام ممکن ہو سکتا ہے۔ کسی کی تعلیم کا انتظام کرنا سب سے بہترین خدمتِ خلق کا درجہ رکھتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ ہدایات واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ "تعلیم" کو معاشرہ کے ہر فرد، چاہے وہ غریب ہو کہ امیر ہو، معزز خاندان کا ہو کہ معمولی خاندان کا، سب کے لیے یکساں طور پر سہل الحصول ہونا چاہیے، اس میں ذات پات، اونچ نیچ، امارت و غربت کو بالکل دخل نہیں ہونا چاہیے اور اگر سماج کا کوئی طبقہ علم و تہذیب سے دور ہو اور ان کے لیے علم حاصل کرنے کے ذرائع بھی نہ ہوں، تو آپؐ نے اس کی ذمہ داری سماج کے پڑھے لکھے اور متمول لوگوں پر رکھی، کہ وہ ان کی جہالت کو دور کرنے کے لیے اپنے اپنے حساب سے اقدام کریں، ورنہ دنیا و آخرت دونوں میں بازپرس کے مستحق ہوں گے۔ارشاد فرماتے ہیں :

" و اللّٰہ لیعلّمنّ قوم جیرانھم ویفقھونھم و یعظونھم و ینھونھم ، و لیتعلمن قوم من جیرانھم و یتفقھون ، لو لأعاجلنھم فی الدنیا . "

(رواہ البخاری فی الوحدان واسحاق بن راہویہ، وابن وابن مندہ (کنز العمال ۵ / ، باب حق الایجار)

" خدا کی قسم ! (دین کا علم اور اس کی سمجھ رکھنے والے لوگوں کا فرض ہے کہ) وہ اپنے (ناواقف اور پسماندہ) پڑوسیوں کو دین سکھائیں، دین کی سمجھ بوجھ ان میں پیدا کرنے کی کوشش کریں اور وعظ و نصیحت سے ان کی اصلاح کریں، انہیں نیک کاموں کی تاکید اور برے کاموں سے روکیں اور اسی طرح ان ناواقف اور پسماندہ پڑوسیوں کو چاہیے کہ وہ خود طالب بن کر اپنے پڑوسیوں سے دین کا علم و فہم حاصل کریں اور ان سے نصیحت لیں یا پھر (اگر یہ دونوں طبقے اپنا اپنا فرض ادا نہیں کریں گے) تو میں ان کو دنیا ہی میں سخت سزا دلواؤں گا۔"

یہ اور اس طرح کی دیگر احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ ہر علاقہ کے بااختیار اور اہل علم پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے پسماندہ پڑوسیوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں اور پسماندہ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان اہل علم سے خود جا کر سیکھیں۔بلاشبہ جب تک یہ سلسلہ چلتا رہا امت میں علم و عمل گھر گھر عام ہوا تھا، مگر عملاً اب یہ بہت ہی کم ہو گیا ہے، اس لیے جہالت و بے تہذیبی اور بے عملی کس زور پر ہے یہ ہم سے مخفی نہیں۔

تعلیم کی اشاعت میں آپ ﷺ کی عملی خدمات

نبوی ذمہ داریوں کی بناء پر آپ کا دن رات کا کام ہی لوگوں تک ربانی تعلیمات پہنچانا تھا، اس لیے آپ ؐ کے ہر عمل اور ہر قول کے پیچھے یہی روح کارفرما ہوتی تھی، مگر باقاعدہ طور پر آپ ؐ نے تعلیم دین کے دو طریقے اپنائے: ایک مختصر مدتی تھا اور ایک طویل مدتی۔ اوّل الذکر میں عرب کے دور دراز علاقوں کے مختلف قبائل سے کچھ لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں آجایا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی معیت میں چند دن رہ کر بنیادی عقائد اور اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہو کر واپس جاتے اور اپنی قوم تک ان باتوں کو پہنچاتے۔ حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے:

" کان ینطلق من کل حی من العرب عصابة فیأتون النبیؐ فیسألونه عمّا یریدون من أمر دینهم و یتفقهوا فی دینهم (تفسیر خازن سورہ توبہ : آیت : وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً)

"عرب کے ہر قبیلہ کا ایک گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتا تھا اور آپ ؐ سے مذہبی امور دریافت کیا کرتا تھا اور دین میں تفقہ حاصل کرتا تھا۔"

آپ ؐ کے "طریقۂ تعلیم" کی دوسری صورت مستقل اور طویل مدتی تھی۔ اس کے لیے آپ ؐ کی نگرانی میں "صفہ" نامی درسگاہ قائم تھی۔ یہ ایک چبوترہ تھا، جہاں پر تشنگانِ علومِ نبوی ؐ ہمیشہ موجود رہتے اور آپ ؐ سے مختلف اوقات میں عقائد شریعت اور اخلاق تعلیم حاصل کرتے۔ ان میں زیادہ تر لوگ وہ ہوتے جو تمام دنیاوی مسائل سے کنارہ کش ہو کر صرف اسی مقصد کی خاطر اپنے آپ کو وقف کر دیتے تھے اور دن رات عبادت و زہد، حصول و خدمتِ علم دین میں مصروف رہتے۔ پروفیسر عطاء اللہ حسینی "درسگاہِ صفہ" کا خوبصورت خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسجد نبوی ؐ ایک عبادت گاہ ہی نہیں، بلکہ ایک عظیم درسگاہ بھی تھی، اس مسجد کا صفہ نامی چبوترہ طلبہ کا گویا رہائشی ہوسٹل تھا، اس درس گاہ میں ۷۰ سے ۸۰ تک طالبِ علم بالعموم رہتے تھے، اس درس گاہ میں جلیل القدر صحابہ ؓ تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے اور خود رسولِ اکرم گویا اس درسگاہ کے صدر مدرس یا پرنسپل تھے، اس ہوسٹل کا مالی انتظام و انصرام حضرت معاذ بن جبل ؓ کے سپرد تھا، گویا وہ اس کے ناظم مالیہ تھے، پھر یہاں سے جو طالبِ علم فارغ التحصیل ہو کر نکلتے، وہ اسٹیٹ کے چھوٹے چھوٹے حلقوں اور دور دراز علاقوں میں تعلیم و تبلیغ کی غرض سے بھیجے جاتے، ان میں سے بیشتر طلبہ کے مصارف لوگوں کے عطیات سے پورے ہوتے تھے، اس طرح اس درس گاہ کے قیام

سے اسلامی ریاست کا اوّلین فرض بھی قوم کی تعلیم کا انتظام و انصرام قرار پایا۔''

(اسلامی زندگی ۲۴۲، طبع دہلی ۱۹۸۷ء)

اہل سیر نے ذکر کیا ہے کہ ان لوگوں میں سے جب کوئی شادی کر لیتا تھا تو اس جماعت سے نکل آتا تھا اور ان کے بجائے دوسرے لوگ داخل ہو جایا کرتے تھے۔

چوں کہ اصحابِ صفہ نے مال و دولت کے حصول کے ذرائع چھوڑ کر اپنے آپ کو صرف خدمتِ علمِ دین کے لیے وقف کر دیا تھا، اس لیے وہ بے حد مفلس اور غریب تھے کہ بعض کے پاس تو پہننے کے لیے ایک کپڑے سے زیادہ نہ ہوتا تھا، جس کو گردن میں باندھ کر گھٹنوں تک چھوڑ دیتے تھے، اس کے باوجود یہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھتے، بلکہ جنگل جا کر لکڑیاں چن کر لاتے اور ان کو بیچ کر آدھا خیرات کرتے اور آدھا خوانِ طریقت پر تقسیم ہوتا۔ اس بناء پر تعلیم اور درس کا وقت رات کو مقرر کیا گیا تھا۔

مسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں: اصحابِ صفہ میں سے ستر افراد رات کو ایک معلم کے پاس جاتے تھے اور صبح تک درس میں مصروف رہتے تھے۔

یہ سب انتظام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ہوا ہوتا تھا۔ آپؐ ہی کی مستقل توجہ ود لچسپی اور دن رات کی محنت سے حضرت ابو ہریرہؓ اور ان جیسے کئی جلیل القدر صحابی پیدا ہوئے جنہوں نے بعد میں علم و فضل اور اشاعتِ علمِ دین میں ایسی بلند پایہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

بیماروں کی عیادت

ہر انسان پر اس کی زندگی میں کچھ ایسے مواقع ضرور آتے ہیں جن میں وہ باوجود ہٹا کٹا ہونے، مالدار اور غنی ہونے کے بے بس اور لاچار ہو جاتا ہے، سب کچھ رکھتے ہوئے بھی دوسروں کی مدد اور توجہ کا محتاج ہو جاتا ہے۔ ''بیماری کے ایام'' ان مواقع میں سے ایک ہیں، کہ آدمی سب کچھ رکھتے ہوئے بھی بے کسی اور بے بسی کا شکار رہتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی اس پر توجہ نہ دے، اس کا خیال نہ رکھے تو بسا اوقات اس کا جانبر ہونا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ آپؐ نے انسان پر آنے والے اس نازک وقت پر بھی توجہ کی اور مریضوں کی عیادت کو خدمتِ خلق کا ایک بہترین وسیلہ قرار دیا اور اس کو اُخروی ثواب کا سبب بتایا۔

خود آپؐ پابندی کے ساتھ مریضوں کی عیادت کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ کو عیادت کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:

إذا اعادَ المُسْلِمُ أخاه أو زاره ، قال الله تعالىٰ : طبت و طاب ممشاك و تبوّأت من الجنّة منزلا . (رواہ الترمذی، مشکوۃ: کتاب الآداب)

"جب کوئی مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کے لیے یا اس سے ملاقات کی خاطر اس کے یہاں جاتا ہے تو تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (دنیا و آخرت میں) تیری زندگی خوش ہوئی، تیرا چلنا مبارک رہا (کہ تو چل کر یہاں تک آیا) اور تجھ کو جنت میں ایک بڑی عالی شان جگہ ملی۔"

آپؐ نے صرف مسلمانوں ہی کی عیادت نہیں فرمائی بلکہ مشرکین اور یہودیوں کی بھی عیادت فرمائی ہے۔ ایک مرتبہ ایک یہودی نوجوان جو کہ آپؐ کی خدمت کیا کرتا تھا کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور اس پر اخیر وقت میں اسلام پیش کیا۔ اس نوجوان نے اپنے والد کی طرف استفسارانہ نظروں سے دیکھا اور ان کا اشارہ پاکر اسلام قبول کرلیا۔

آپؐ کی سخاوت اور دریا دلی

خستہ حالی اور فقر و فاقہ کے باوجود آپؐ کسی سائل کو مایوس واپس نہیں کرتے تھے، اگر آپؐ کے پاس کچھ نہ ہوتا تو صحابہ کرامؓ سے لے کر دیتے۔ حدیث شریف:

" عن جابرؓ قال : ما سئل رسول الله شيئاً قط فقال لا ." (الوفا باحوال المصطفیٰ مؤلفہ ابن الجوزی : ۴۴۵/، طبع بیروت)

"حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سائل کے جواب میں "نہ" نہیں کیا۔"

آپؐ خاص طور پر نو مسلموں کو تألیف قلوب کی خاطر خوب نوازتے اور اگر کوئی اسلام کے نام پر مانگتا تو اس کی فوراً حاجت روائی کرتے اور اتنا دیتے کہ لینے والا خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ حدیثِ مبارکہ ہے:

عَنْ أنسٍؓ : أنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ يُسْأَلُ شَيْئاً عَلى الإِسْلَامِ إلا أعطاه قَالَ : فَأتَاهُ رَجُلٌ فَسَألَهُ ، فَأمَرَ لَهُ بِشَاءٍ كَثِيرٍ بَيْنَ الْجَبَلَيْنِ مِنْ شَاءِ الصَّدَقَةِ قَالَ فَرَجَعَ إلَى قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْم أَسْلِمُوْا فَإنَّ مُحَمَّدًا يُعْطِي عَطَاءَ مَنْ لَايَخْشىٰ الفاقة (الوفاء باحوال المصطفیٰ مؤلفہ ابن الجوزی : ۴۴۶/ طبع بیروت)

(حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بھی اسلام کے نام پر مانگا جاتا تو ضرور عطا فرماتے۔ ایک مرتبہ ایک آدمی نے آکر سوال کیا، آپؐ نے اس کو صدقہ میں آئی ہوئی ڈھیر ساری بکریاں جو کہ دو پہاڑوں کے درمیان (چر رہی) تھیں عطا فرمادی، وہ اپنی قوم کے

پاس گیااور کہنے لگا: اے لوگو! مسلمان ہو جاؤاس لیے کہ محمد اتنا زیادہ دیتے ہیں جس کے ختم ہونے کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔)

اکثر آپؐ کے پاس مختلف لوگوں کی طرف سے تحفہ تحائف آتے رہتے تھے جن کو آپؐ لوگوں پر خرچ فرمادیتے، بیشتر اوقات ایسا ہوتا کہ کوئی شئ صبح آتی اور شام تک تقسیم ہو جاتی۔ حضرت ہارون بن رناب بیان کرتے ہیں:

" قَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ صلى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْعُوْنَ أَلْفَ دِرْهَم ، وَ هُوَ أَكْثَرُ مَالٍ أتىٰ بِهٖ قَطُّ فَوَضَعَ عَلٰى حَصِيْرٍ ، ثُمَّ قَامَ فَقَسَمَهُ فَمَا رَدَّ سَائِلاً حَتّٰى فَرَغَ مِنْهُ . "(الوفاء ۴۴۷)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ستر ہزار درہم (بطورِ ہدیہ) آئے۔ یہ آپؐ کے پاس آنے والے مالوں میں سب سے زیادہ مقدار تھی، چنانچہ اس کو آپؐ نے ایک چٹائی پر ڈال دیا اور تقسیم کرنے لگے، یہاں تک کہ ہر مانگنے والے کو اور ہر سائل کو عطا کیا اور سب کے سب تقسیم کر کے فارغ ہوئے۔

رمضان کے مہینہ میں دیگر رفاہی چیزوں کے خاص اہتمام کے ساتھ لوگوں کی مالی مدد کرنے میں بھی بہت زیادہ اضافہ کر دیتے تھے۔

حدیث شریف میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ وَ عَائِشَةَؓ قَالَا : كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِذَا دَخَلَ شَهْرُ رَمْضَانَ أَطْلَقَ كُلَّ أَسِيْرٍ وَ أَعْطَى كُلَّ سَائِلٍ .(ابن سعد: الطبقات الکبری: ۱/۳۷۷، طبع بیروت)

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینہ میں ہر قیدی کو آزاد کر دیتے تھے، اسی طرح ہر سائل کو عطا فرماتے تھے۔

آپؐ ذخیرہ اندوزی اور مال و دولت کو جمع کر کے رکھنے کے سخت خلاف تھے، کہ خلق خدا پریشانی میں مبتلا رہے اور مال و دولت کو جمع کیا جائے، یہ آپ کو پسند نہ تھا حضرت انسؓ سے مروی ہے:

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدَّخِرُ شَيْئاً (شمائل ترمذی، الوفاء ۴۸۰)

(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ذخیرہ اندوزی (مال و دولت جمع) نہیں فرماتے تھے۔)

اسی سلسلہ کی ایک دلچسپ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں:

" أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰى بِلَالٍ وَ عِنْدَهٗ صُبْرَةٌ مِنْ تَمْرٍ ، فَقَالَ : مَا هٰذَا يَا بِلَالُ ؟ فَقَالَ ادَّخِرُهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! قَالَ أَمَا تَخْشٰى أَنْ يَكُوْنَ لَهٗ سِجَارٌ فِي

النَّارِ أَنْفِقْ يَا بِلَالُ ! وَ لَا تَخْشَ إِقْلَالًا !(طبرانی: معجم الکبیر ۱/ ۳۲۵، الوفاء ۴۴۶)

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلالؓ کے پاس تشریف لائے، دیکھا کہ ان کے پاس کھجور کا ڈھیر ہے، دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ حضرت بلال کہنے لگے: میں اس کو جمع کر رہا ہوں اے اللہ کے رسول! آپؐ نے فرمایا کیا تم کو اس سے ڈر نہیں لگتا کہ اس کے بدلے جہنم میں تم کو انگارے ملیں اے بلال! خرچ کرو اور کم ہو جانے سے مت ڈرو۔"

عوامی مفادات کی نگرانی

عوام سے متعلقہ مفادات کی اگر حاکمِ وقت صحیح نگرانی نہ کرے تو بڑی بے اعتدالیاں پیدا ہوتی ہیں، نچلہ عملہ ہر معاملہ میں افراتفری مچا کر رکھ دیتا ہے، تجارت میں کساد بازاری اور دھوکہ بازی عروج پر پہنچ جاتی ہے، اسی طرح دیگر کاموں میں "اہل معاملہ" عوام کا خون تک نچوڑ لینے سے گریز نہیں کرتے۔ اس کی مثالیں ہم کو آپ کو آج کے ماحول میں صاف نظر آتی ہیں۔ آپؐ بذاتِ خود اس قسم کے کاموں کی نگرانی فرماتے اور تمام لوگوں کو معاملات میں راست بازی اپنانے کی ہدایت فرماتے، اگر کوئی اس پر عمل کرنے میں کوتاہی برتتا تو اس کو سزا بھی دیتے۔ بخاری شریف کی حدیث ہے:

"عن عبد اللہ بن عمرؓ قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ النَّاسَ فِي عَهْدِ النَّبِيِّ يَبْتَاعُونَ جِزَافاً يَعْنِي الطعام يضربون أن يبيعوه فِي مكانهم حتّٰى يُؤْوُوْهُ إِلٰى رِحَالِهِمْ" (بخاری، کتاب البیوع)

(حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دیکھا کہ جو لوگ تخمیناً غلہ خریدتے تھے ان کو اس بات پر سزا دی جاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے خود اسی جگہ بیچ ڈالیں جہاں اس کو خریدا تھا۔)

حالات کا اندازہ لگانے کے لیے کبھی آپؐ بنفسِ نفیس بازار جاتے اور لوگوں کی خرید و فروخت، خاص طور پر بیچنے والوں کا جائزہ لیتے۔ ایک دکاندار کے غلہ میں ہاتھ ڈالا تو اندازہ ہوا کہ اندر سے نم ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ کہنے لگے بارش سے بھیگ گیا ہے۔ ارشاد فرمایا: تم نے اس حصہ کو اوپر کیوں نہیں کر لیا؟ کہ لوگوں کو نظر آتا رہتا، پھر فرمایا: "مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا" یعنی جو لوگوں کو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان ۱/ ۵۳، طبع دیوبند)

لوگوں کے تنازعات میں صلح کے لیے اقدامات

آپؐ جس پیغام کو لے کر آئے تھے، اس کا مقصد ہی دنیا سے لڑائی جھگڑے، فتنہ فساد اور

آپسی بھید بھاؤ ختم کرنا تھا، اس لیے جہاں کہیں لوگوں میں کسی قسم کے لڑائی جھگڑے کی آپ کو خبر ملتی وہاں پہنچ کر صلح کرانے کی کوشش کرتے۔ ایک مرتبہ اہل قباء میں جھگڑا ہو گیا اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ ایک دوسرے پر سنگ باری کرنے لگے۔ آپ کو جب اس کی خبر ہوئی تو چند صحابہ کے ساتھ مصالحت کرانے کی غرض سے وہاں تک پیدل تشریف لے گئے اور صلح کروا کر واپس ہوئے۔ (بخاری، کتاب الصلح)

حضرت کعب بن مالکؓ کا کچھ قرض ابن ابی حدرد پر تھا۔ انہوں نے مسجد ہی میں تقاضا شروع کر دیا؛ جب کہ حدرد قرض کا ایک حصہ معاف کروانا چاہتے تھے۔ شوروغل کی آواز سن کر آپؐ اپنے حجرے سے باہر نکلے اور کعبؓ کو پکار کر مخاطب کیا۔ کعبؓ نے لبیک کہا تو آپؐ نے ہدایت کی آدھا قرض معاف کرو۔ وہ راضی ہو گئے۔ آپؐ نے حدرد سے کہا کہ جاؤ اور بقیہ ادا کر دو۔

اس متوسط سے جائزہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ زندگی کے دوسرے میدانوں کی خدمات اور نبوی ذمہ داریوں کے نبھانے کے ساتھ ساتھ آپؐ نے خدمتِ خلق اور رفاہی وفلاحی کاموں میں بھی انتہائی اعلیٰ اسوہ اور نورانی تعلیمات چھوڑی ہیں اور جب ہم آپؐ کے بعد آنے والے مسلم اور غیر مسلم دونوں طبقوں سے متعلقہ مصلحین اور سماجی خدمت گاروں کی زندگی اور ان کے چھوڑے ہوئے خیالات کا باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں، تو اس بات کا واضح طور پر اندازہ ہوتا کہ سب درحقیقت آپؐ ہی کے خوشہ چیں تھے اور وہ "خدمت گار" جو ایمان کی دولت سے محروم تھے، خوشہ چین ہونے کے معاملہ میں بھی مکمل نہ تھے، کہ خدمتِ خلق کے کسی ایک گوشہ کو اپنایا تو دوسرے گوشوں کو نظر انداز کر گئے۔ یہ آپؐ ہی کی ذات بابرکات تھی جس نے "خدمتِ خلق" کے بھی ہر ہر پہلو پر توجہ فرمائی اور عملی مثالوں کے ساتھ ساتھ آفاقی خیالات کا ایسا زبردست ذخیرہ پیش فرمایا کہ جس پر عمل نہ صرف انسانوں کے لیے چین وسکون کا سبب ہے، بلکہ دیگر جانداروں اور مخلوقات کے لیے باعثِ راحت واطمینان ہے!

☆☆☆

پیغمبر اسلام ﷺ کی عائلی زندگی

مولانا سرفراز احمد قاسمی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس روئے زمین پر خدا کے آخری نبی اور رسول تھے، اس لیے یہ دین بھی مکمل ہے اور رسول بھی کامل ترین۔ آپؐ کے اصحاب تاریخ انسانیت کے مقدس ترین اشخاص کہے جاسکتے ہیں۔ خود آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے شرفِ صحابیت کے لیے ان کا انتخاب فرمایا ہے، ان میں سے کسی کی بھی اتباع دنیوی و اخروی کامیابی کی ضمانت ہے، چہ جائیکہ خود رسولؐ اللہ کی حیاتِ مبارکہ میں ان نقوش کی تلاش و جستجو جو شب و روز کے لمحات میں بکھرے ہوئے ہیں اور جن کی اتباع کے بغیر کوئی شخص حقیقی فوز و فلاح سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر اسلامؐ کی سیرتِ طیبہ کا ایک اعجازی پہلو یہ بھی ہے کہ آپؐ کی حیاتِ مبارکہ کا کوئی گوشہ آج تشنہ تحقیق نہیں، اس اعتبار سے تمام انبیاءِ سابقین میں آپؐ ممتاز اور منفرد نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ آپؐ کی خانگی اور عائلی زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات تک صفحۂ قرطاس پر ثبت ہیں اور احادیث کے آئینہ میں اس کی مکمل تصویر آج بھی دیکھی جاسکتی ہے!

ایک کامل اور مکمل انسانی زندگی کی بنیادی شناخت یہ ہے کہ دنیا میں چھوٹے بڑے، حاکم و محکوم، دوست و دشمن، اپنے اور پرائے، امیر و غریب، غرض کہ ہر سطح اور ہر طبقہ کے لوگوں سے اس کے تعلقات روشنی میں ہوں اور لوگوں کے لیے مشعل راہ کا درجہ رکھتے ہوں، وہیں اپنی ازواج، خدام، اولاد، متعلقین اور اقرباء و رشتہ داروں میں بھی وہ محبوب و مقبول ہوں اور ان کے ساتھ تعلق و سلوک کے باب میں بھی اس کی زندگی اسوہ اور مثال ہو۔ اس معیار پر دیکھا جائے تو پیغمبر اسلام کی زندگی اپنی مثال آپ ہے۔ انبیاءِ سابقین کی زندگی کے چند گوشے ہی تاریخ کی روشنی میں ہیں اور ایک بڑا حصہ وہ ہے جو گوشۂ گمنامی میں دفن ہے۔ آپؐ کی کامیاب زندگی کا راز آپ کا یہ ارشاد ہے:

"بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ ."

"میں اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔"

سعید بن ہشام نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ آپؐ کے اخلاق کیسے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: کیا تو نے قرآن نہیں پڑھا؟ آپؐ کا اخلاق تو گویا سراپا قرآن تھا! گویا قرآن نے زندگی کے جو اصول اور آداب بتائے ہیں، آپؐ اس کی مکمل تصویر تھے۔ اسلام کی نگاہ میں محض ظاہری وضع داری اور وقتی مداہنت و تملق کا نام اخلاق نہیں ہے، بلکہ قول و فعل کی یکسانیت اور زبان و دل کی رفاقت کے ساتھ شرافت اور حسن سلوک کا نام "اخلاق" ہے۔

کسی بھی انسان کے اخلاق کی سب سے بڑی امتحان گاہ خود اس کا گھر ہے، گھر کے لوگوں سے صبح و شام اور شب و روز کا سابقہ ہے، گھر کے ماحول میں انسان اپنا "حقیقی مزاج" چھپا نہیں سکتا، اسی لیے آپؐ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ أَحْسَنَكُمْ خُلُقًا أَحْسَنُكُمْ لِأَهْلِهِ (تم میں سب سے بہتر اخلاق اس کے ہیں جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ بہتر اخلاق رکھتا ہو۔) اسی پس منظر میں آپؐ کی عائلی زندگی کے شب و روز پر یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں۔

انسان دن بھر کی مشغولیتوں کے بعد گھر میں سکون کا متلاشی ہوتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ چند لمحات ایسے گذریں کہ دنیاوی امور سے ذہن فارغ ہو اور دل و دماغ کو سکون میسر ہو، طبعی اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی ایک انسان کو اس کی ضرورت پیش آتی ہے اور یہ بات اسی وقت ہو سکتی ہے جب گھر کا ماحول اور فضا خوش گوار ہو، افرادِ خاندان میں انس و محبت، رواداری، باہمی اعتماد اور ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ پیغمبر اسلامؐ کی خارجی زندگی کی ذمہ داریاں اتنی متنوع اور وسیع تر تھیں کہ اس کے ساتھ اپنے اہلِ خانہ اور افرادِ خاندان کے لیے وقت نکالنا اور ان کے حقوق کی رعایت کرنا آج کے زمانہ کو دیکھتے ہوئے ایک مشکل ترین بات تھی، لیکن حیاتِ مبارکہ کے مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ازواجِ مطہرات ہوں یا اولاد، خدام ہوں یا اقرباء، متعلقین ہوں یا احباب، آپؐ ہر ایک کے حقوق کی رعایت فرماتے اور زندگی کے کسی موڑ پر آپؐ اس سے غافل نظر نہیں آتے، ہر آن آپؐ کو ان کے حقوق کی رعایت دامن گیر رہتی، ایسا بھی نہیں کہ آپؐ اپنے ماتحت افراد کے لیے ایک تند خو اور سخت گیر سرپرست کی حیثیت رکھتے ہوں، بلکہ بیویوں کے حق میں ایک محبت کرنے والے شوہر، اولاد کے حق میں ایک شفیق و مہربان باپ اور خدام کے حق میں ایک فراخ چشم اور حلیم و بردبار آقا کی صورت میں آپؐ کی تصویر ابھرتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ گا ارشاد ہے:

"خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَ اَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ." (۱)

"تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے اہل (ازواج) کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے اہل کے لیے تم سب سے زیادہ بہتر ہوں۔"

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا: کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اخلاق کے اعتبار سے اچھے ہوں اور تم میں سب سے اچھے وہ حضرات ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں اچھے ہوں۔

ازواج کی دینی تربیت

ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے دینی جذبہ کی بنیاد پر تعلقات قائم کرتا ہے تو اس پر فرض ہے کہ وہ اس کا خیر خواہ ہو اور بہترین خیر خواہی یہ ہے کہ اگر اس کا رفیق دنیا میں اس طرح منہمک ہو جائے کہ اخروی زندگی کی کامیابی کی فکر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو وہ اس کو صحیح راہ پر لانے کی فکر کرے۔ رفیقۂ حیات خوشی وغم میں برابر کی شریک ہوتی ہے، وہ سب سے زیادہ اس کی مستحق ہے کہ اس کی اخروی کامیابی کی فکر شوہر کو تڑپائے۔ قرآن کریم میں تمام اہل ایمان کو حکم دیا گیا: "اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔" (تحریم: ۶/) ایک آیت میں خصوصی طور پر کو حکم فرمایا گیا: وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا (مریم: ۱۳۲/) "اپنے گھر والوں کو نماز کی تاکید کیجئے اور خود بھی اس کے پابند رہیے۔"

آپ کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ ازواجِ مطہرات علم اور تفقہ میں ممتاز حیثیت کی حامل تھیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کے بعد حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ حدیث کی روایت کرنے والی ہیں، گو تمام ہی ازواج کو دینی امور اور کے دعوت کے کام سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا، لیکن تفقہ فی الدین اور رسوخ فی العلم کا نشانِ امتیاز جو حضرت عائشہؓ کو ان کے ذاتی شوق، دلچسپی، ذوق، لگن اور جستجو کی بنا پر حاصل ہوا وہ ان ہی کا حصہ تھا؛ گو دوسری ازواجِ مطہرات بھی اس فضل و کمال سے محروم نہ تھیں۔

ازواجِ مطہراتؓ میں سے ہر ایک اپنے علم و عمل اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے عام مسلمانوں سے ممتاز تھیں، لیکن بعض چھوٹی اور معمولی باتوں پر جو مزاجِ شریعت سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں اور بشری تقاضے کی بنا پر ازواج سے صادر ہو جاتیں، آپ تنبیہ فرماتے اور اظہارِ ناراضگی میں کسی مصلحت کو راہ نہ دیتے۔ ایک مرتبہ یہودیوں کی ایک جماعت آپ کے پاس آئی اور ان لوگوں نے "السام علیك"

(۱) ترمذی: ۲/۲۲۸

(خدا کرے تم کو موت آئے) کہا۔ حضورؐ نے جواب میں "وعلیکم" (یعنی تم کو) فرمایا۔ حضرت عائشہؓ جو اس کو سن رہیں تھیں اور اس اندازِ تخاطب میں چھپے ہوئے عناد اور جذبۂ عداوت سے واقف تھیں، کہنے لگیں: "السام علیکم ولعنکم اللّٰہ و غضب علیکم" آپؐ نے فرمایا: اے عائشہ! نرمی اختیار کرو اور اپنے آپ کو تند گوئی سے بچاؤ (مشکوٰۃ: ۳۹۸) ایک مرتبہ امّ المومنین حضرت صفیہؓ کا اونٹ دورانِ سفر بیمار ہو گیا اور حضرت زینبؓ کے پاس زائد سواری کے لائق اونٹ موجود تھا، آپؐ نے فرمایا: زینب! یہ اونٹ صفیہ کو دے دو۔ حضرت زینبؓ نے کہا: میں اس یہودیہ کو نہیں دوں گی۔ آپؐ اس کے ان انداز سے اس قدر ناراض ہوئے کہ کئی دنوں تک گفتگو کرنا ترک فرمادیا۔ (۱)

اولاد سے محبت کا اور ان کی آخرت کی فکر

اکثر انبیاءِ کرام نے اللہ ربّ العزت سے ولدِ صالح کی دعا کی ہے، چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا قرآنِ مجید میں یوں مذکور ہے: "رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً" (آلِ عمران: ۳۸) "اے میرے رب! تو اپنے پاس سے مجھے پاکباز اولاد عطا فرما!" اولادِ صالح کی خواہش ایک فطری جذبہ ہے، صالح اولاد کے ذریعہ دنیا و آخرت دونوں جگہ عزت و سرفرازی حاصل ہوتی ہے، لیکن محبتِ پدری میں انسان اولاد کی جائز و ناجائز خواہشات کی تکمیل میں لگا رہتا ہے اور گویا اپنی اولاد کو غیر صالح بنانے میں غیر محسوس طریقے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اولاد سے محبت کرنا، ان کی اسلامی خطوط پر تربیت کرنا، دنیوی زندگی کی مصالح کے ساتھ ساتھ اخروی کامیابی کو مقصود بنا کر ان کی نشو و نما کی فکر کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور یہ تمام انبیاء کی سنت رہی ہے۔ حدیثِ رسول ہے کہ جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کی نیکیوں کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، مگر تین چیزیں ایسی ہیں جن کا ثواب ہمیشہ اس کو ملتا رہتا ہے: صدقۂ جاریہ، علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے، صالح اولاد۔

پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں بھی افراط و تفریط سے بچتے ہوئے ایسے انمٹ نقوش چھوڑتے ہیں جو رہتی دنیا تک مشعل راہ ہیں۔ یوں تو حضورؐ کو کئی اولاد ہوئیں، لیکن عمر کے آخری منزل میں جب حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ہوئی تو آپؐ بہت مسرور تھے اور جب ان کا انتقال ہوا تو آپؐ پر غم و حزن کے آثار بھی اسی نسبت سے ظاہر ہوئے، لیکن اس موقعہ پر کوئی عمل اللہ کے حکم کے خلاف سرزد نہیں ہوا۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی نعش آپؐ کے گود میں تھی اور آنسو بہہ رہے تھے، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے کہا: اللہ کے

(۱) مشکوٰۃ: ۴۳۳

رسول! آپ اور یہ آنسو؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ جذبۂ محبت ہے، آنکھ آنسو بہارہی ہے اور دل غمگین ہے، لیکن زبان سے وہی کلمات ادا ہوں گے جو اللہ کے نزدیک ناراضگی کا باعث نہ ہوں، پھر فرمایا: ابراہیم! تمہارے فراق سے ہم غمگین ہیں۔ حضرتؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے بچے کا انتقال ہو گیا، اس موقعہ پر حضورؐ نے تسلی دیتے ہوئے جو جملہ ارشاد فرمایا، خواتین جو زیادہ جذباتی ہوتی ہیں ان کی تربیت کے لیے اس سے بہتر بات نہیں کہی جاسکتی۔ ''اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَ لَہٗ مَا اَعْطٰی وَ کُلٌّ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمّٰی فَلْتَصْبِرْ وَ لْتَحْتَسِبْ''(۱)

اولاد سے محبت کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ اس کی تربیت اس انداز پر ہو کہ آخرت میں کامیابی کی فکر اور دنیا کی آسائش سے بے رغبتی پیدا ہو۔ ایک مرتبہ آپؐ کے پاس غلام اور باندیاں آئیں، حضرت فاطمہؓ کو ایک خادم کی ضرورت تھی، گھر کے سارے کام خادم کے نہ ہونے کی وجہ سے خود ہی انجام دیتی تھیں، اس غرض سے حضورؐ کے پاس آئیں اور حضرت علیؓ نے اُن کے آمد کا مقصد بیان فرمایا۔ پیغمبرؐ کے علاوہ کوئی اور باپ ہوتا تو اپنی بیٹی کی ضرورت کو سب سے مقدم رکھتا، لیکن پیغمبرؐ کی نگاہ دنیا کے بجائے آخرت پر تھی، فرمایا: اے فاطمہ! خدا سے ڈرو، اپنے رب کے فرائض ادا کرو، اپنے گھر والوں کا کام کرو اور جب بستر پر جاؤ تو ۳۳ بار خدا کی تسبیح کرو ۳۳ بار خدا کی حمد کرو اور ۳۴ بار خدا کی تکبیر کرو، یہ پورا سو ہو گیا، یہ تمہارے لیے خادم سے بہتر ہے۔(۲) ایسا بھی نہیں ہے کہ آپ کو ان کی مشقت کا احساس نہیں تھا، یا آپ کو حضرت فاطمہؓ سے محبت کچھ کم تھی۔ حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا: لوگوں میں اللہ کے رسول کو سب سے زیادہ محبت کس سے تھی؟ حضرت عائشہؓ نے کہا: فاطمہؓ سے (۳) روایت ہے کہ جب آپؐ سفر سے لوٹتے تو لوگوں میں حضرت فاطمہؓ کے گھر پہلے جاتے اور ان سے ملاقات کرتے اور جب حضرت فاطمہؓ سے ملاقات ہوتی تو ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے۔

گھر میں بچوں کے ساتھ شفقت

آپ کو بچوں سے بہت محبت تھی، راستہ میں بچے کھیلتے ہوئے مل جاتے تو آپ اُن کو سلام کرتے، گھر میں بچوں کے ساتھ خوش فعلی کرتے، ان کو کاندھے پر بٹھاتے، گود میں لیتے، پیار کرتے، چومتے۔ معلوم ہوا کہ مزاج میں اتنی سختی نہ ہونی چاہیے کہ بچے دیکھتے ہی سہم جائیں اور چھپنے لگیں۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ کسی ضرورت سے حضورؐ کے پاس آیا، آپؐ سے ملاقات ہوئی، میں نے محسوس کیا: آپ کچھ اٹھائے ہوئے ہیں، میں نے پوچھا تو آپؐ نے تھیلی کھولی،

(۱) مشکوۃ: ۱۵۰/ (۲) صحیح مسلم (۳) مشکوۃ: ۵۷۰/

اس میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ تھے، آپؐ نے فرمایا: یہ دونوں میرے بیٹے ہیں اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں، اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں، تو ان دونوں سے محبت فرما اور اس شخص سے بھی جو ان دونوں سے محبت رکھے۔(۱)

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مجھ کو اپنے سینے سے لگایا اور دعا دیتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! تو اس کو کتاب اللہ کا علم عطا فرما!(۲) ترش روئی، تند مزاجی اور چڑچڑاپن آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں بالکل نہیں تھی، انتہائی شفقت سے پیش آتے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے۔ ایک مرتبہ حضرت اقرع بن حابسؓ آپؐ کے پاس آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ آپؐ حضرت حسنؓ کا بوسہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے دس بچے ہیں، لیکن آج تک میں نے کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ آپؐ نے فرمایا: "مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ" (۳) (جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا) بچوں میں کوئی عادت اگر غلط ہوتی تو اس کی تربیت بھی فرماتے۔ امّ المؤمنین حضرت امّ سلمہ کے صاحبزادے حضرت عمر ابن ابی سلمہؓ جو آپؐ ہی کے پرورش میں تھے، ایک مرتبہ دستر خوان پر کھانے میں ساتھ تھے اور یہاں وہاں لپک کر کھا رہے تھے، آپؐ نے فرمایا: "كُلْ مِمَّا يَلِيكَ"، "اپنے قریب سے کھاؤ" (۴)

اہل خانہ کے ذوق و مزاج کی رعایت

شریعتِ اسلامیہ کا ایک امتیاز اس کا اعتدال و توازن ہے، وہ احکام خداوندی کا پابند بھی کرتی ہے اور انسان کی فطری ضروریات کی رعایت بھی ملحوظ رکھتی ہے؛ آپ کی عائلی زندگی بھی اسلام کے اس مزاج و مذاق کی آئینہ دار ہے۔ ایک مرتبہ مسجد نبویؐ میں عید الفطر کے موقعہ سے چند حبشی نوجوان نیزوں کا کھیل کر رہے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں: میں نے دیکھنے کی خواہش کی، آپؐ آگے کھڑے ہو گئے اور آپؐ کے مونڈھے اور گردن کے درمیان سے میں کھیل دیکھتی رہی۔(۵)

بچپن کی عمر کھیل کی ہوتی ہے، امّ المؤمنین حضرت عائشہؓ جب رخصت ہو کر مدینہ آئیں تو اس وقت بھی ان کی عمر زیادہ نہ تھی اور اپنے سہیلیوں کے ساتھ گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی تھیں، لیکن آپؐ نے کبھی اس پر ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل میں مشغول ہوتی کہ اتنے میں حضورؐ تشریف لاتے، میری سہیلیاں چھپ جاتیں، حضور ان کو اجازت دیتے کہ وہ حضرتِ عائشہؓ کے ساتھ کھیلیں۔(۶) کبھی کبھی ازواجِ مطہراتؓ کی موجودگی

(۱) ترمذی: ۲/۲۱۷ (۲) مشکوۃ: ۵۶۹/ (۳) ترمذی: ۲/۱۳ (۴) ترمذی: ۲/۷ (۵) مشکوۃ: ۲۸۰/ (۶) مشکوۃ: ۲۸۰/

میں خوش طبعی کی باتیں بھی کرتے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں ہم دونوں ایک ہی برتن سے غسل کرتے اور پانی لینے میں چھینا جھپٹی بھی ہوتی۔ کبھی دوڑ کا مقابلہ ہوتا، ایک مرتبہ دوڑ کا مقابلہ ہوا، حضرت عائشہؓ دبلی پتلی تھیں، آگے بڑھ گئیں اور حضورؐ پیچھے رہ گئے، پھر کچھ زمانے کے بعد جب یہی مقابلہ ہوا تو حضورؐ نے سبقت حاصل کی، حضورؐ نے فرمایا یہ اس کا بدلہ ہو گیا۔(۱)

اہل خانہ کے ساتھ خوشی و مسرت کا اظہار اور ان کے غم میں برابر کی شرکت ازدواجی زندگی کو خوشگوار اور پر سکون بناتی ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انس و محبت کا اظہار قول کے ساتھ عمل سے بھی ہو۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت صفیہؓ کا اونٹ سفر میں بیمار ہو گیا، وہ بیٹھی رو رہی تھیں اور آنسو جاری تھے، آپؐ ان کو تسلی دیتے تھے اور اپنے دامن سے آنسو پوچھتے جاتے تھے۔ لطف و محبت کی ایسی مثال شاید ہی کسی رہنما یا قائد نے چھوڑی ہو!

ازواجِ مطہرات کے درمیان عدل

پیغمبر اسلامؐ نے جملہ گیارہ شادیاں کیں اور بیک وقت نو بیویاں آپؐ کے ساتھ تھیں۔ آپ کا معمول تھا کہ جب مدینہ میں ہوتے تو عصر کی نماز کے بعد تمام ازواج کے پاس جاتے اور ہر ایک کی ضرورت معلوم کرتے اور اس کی تکمیل فرماتے، ازواج کے مابین شب باشی کی باری متعین ہوتی، گو آپؐ پر اس کی پابندی شرعاً لازم نہیں تھی، لیکن آپؐ بہ طورِ خود پوری سختی کے ساتھ اس کا اہتمام کرتے۔ ایک مرتبہ حضرت حفصہؓ نے اپنی باری کا دن حضرت عائشہؓ کو ہبہ کر دیا۔ حضورؐ معمول اور باری کے مطابق حضرت حفصہؓ کے گھر میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت عائشہؓ موجود ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا: تم کہاں؟ یہ حفصہ کی باری ہے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: **هذا فضل الله يؤتيه من يشاء** (یہ تو اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔) ازواج کے مابین انصاف کا خیال اور اس سلسلہ میں عند اللہ جوابدہی کا احساس اتنا شدید تھا کہ اللہ ربّ العزت سے دعا کرتے رہتے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

"اِنَّ النَّبِیَّ کَانَ یَقْسِمُ بَیْنَ نِسَائِہٖ فَیَعْدِلُ وَ یَقُوْلُ : اَللّٰھُمَّ ھٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِکُ وَ لَا اَمْلِکُ۔" (۲)

"نبی کریم ﷺ بیویوں کے درمیان باری لگانے میں انصاف کو ملحوظ رکھتے اور فرماتے: اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے جس کا میں مالک ہوں، پس میری مؤاخذہ نہ کیجئے اس چیز میں جس کے آپ مالک ہیں، میں مالک نہیں، یعنی قلبی رجحان۔"

آپ کا معمول تھا کہ جب سفر پر روانہ ہوتے تو ازواج کے درمیان قرعہ اندازی کرتے،

(۱) ابوداؤد: ۱/۳۴۸ (۲) مشکوٰۃ: ۲۷۹/

جس کا نام قرعہ میں نکل جاتا، ان کو ساتھ لے جاتے۔ یہ بھی ازواج کی تالیفِ قلب کے لیے تھا، اس لیے کہ سفر کی حالت حضر سے مختلف ہوتی ہے اور اس کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں؛ اس لیے سفر میں شوہر کو اختیار ہے کہ جس بیوی کو ساتھ رکھنا مناسب سمجھے اس کو سفر میں لے جائے۔(۱)

اہل و عیال پر خرچ کرنے میں فراخی

انسان پر جو حقوق واجب ہیں ان میں اہل و عیال پر خرچ کرنا بھی ہے۔ ان کی ضرورت کی تکمیل کے لیے محنت و مشقت کرنا واجب ہے۔ لوگ عام طور پر اس کو ثواب کا کام نہیں سمجھتے؛ آپؐ نے اس کی اصلاح فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل یہ ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے نفقة الرجل علی اهله صدقة (شوہر کا اپنی بیوی پر خرچ کرنا نیکی ہے۔(۲) حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے:

"اِنَّ النبیؐ قال افضل الدینار دینار ینفقه الرجل علی عالیه و دینار ینفقه الرجل علی دابته فی سبیل الله و دینار ینفقه الرجل علی اصحابه فی سبیل الله"

غلام و خدام کے ساتھ حسنِ سلوک

انسانوں کا یہ طبقہ ہر دور میں مظلوم رہا ہے، سوائے اس تبدیلی کے جو پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کے بعد دنیا میں ظہور پذیر ہوئی؛ ورنہ ہر زمانہ میں یہ طبقہ ستم زدہ اور مظلوم رہا۔ پیغمبر اسلامؐ کی سیرت اس باب میں تمام انسانوں کے راہ نما ہے۔ آپؐ نے آقاؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: لوگو! جو خود کھاؤ وہی ان کو بھی کھلاؤ، جیسا کپڑا خود استعمال کرو وہی کپڑا ان کے لیے بھی تیار کرو، وہ تمہارے بھائی ہیں۔ غلام کو بھائی قرار دے کر آپؐ نے اس دیوار کو منہدم فرمادیا جو دو انسان اور حاکم اور محکوم کے درمیان کھڑی کردی گئی تھی۔ خادموں کیساتھ شب و روز اور ہر وقت کا ساتھ ہوتا ہے، کوتاہی، لغزش، بھول چوک انسانی فطرت ہے، لیکن آپؐ کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے:

"خدمت رسول الله صلی الله علیه وسلم عشر سنین فما قال لی اُف قط، و ما قال لشیئ صنعته لِمَ صنعته، و لا لشیئ ترکته لِمَ ترکته."

"میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی، لیکن کبھی آپؐ نے اُف نہیں کہا اور نہ کبھی یہ کہا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور جس کام کو میں نہیں کرتا آپؐ یہ نہیں فرماتے تو نے یہ کام کیوں نہیں کیا۔" (۳)

(۱) مشکوٰۃ: ۲/۲۷۹ (۲) ترمذی: ۲/۱۸ (۳) ترمذی: ۲/۲۱

دس سال کی رفاقت کے باوجود آپؐ نے کبھی "اف" تک نہیں کہا، یہ تحمل وبردباری اور شفقت کی ایک مثال ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے کسی جاندار کو، خادم کو اور کسی خاتون کو کبھی نہیں مارا۔ خادموں کے ساتھ آپ کا برتاؤ اتنا مشفقانہ ہوتا کہ کبھی خدام کو اپنے دل کی بات کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ خود حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپؐ اخلاق کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے اچھے تھے، ایک مرتبہ کسی کام سے مجھ کو کہیں جانے کو کہا، میں نے کہہ دیا خدا کی قسم نہیں جاؤں گا اور میرے دل میں یہ بات تھی کہ جاؤں گا، اس لیے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، میں چلا، راستہ میں بچے کھیل رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو گردن کے پچھلے حصہ سے پکڑا، میں نے دیکھا تو آپ مسکرا رہے تھے، فرمایا: اے اُنیس! جاؤ جہاں جانے کا میں نے حکم دیا ہے، میں نے عرض کیا: جاؤں گا اللہ کے رسول!(۱)

گھر کے معمولات

معمولِ مبارک تھا کہ گھر میں داخل ہوتے تو سلام کرتے اور ایسا انداز ہوتا کہ سونے والے بیدار نہ ہوں اور جو بیدار ہوں سلام کی آواز سن لیں، اگر گھر میں کوئی چھوٹا موٹا کام ہوتا تو خود انجام دے لیتے۔ حضرت اسودؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں آکر کیا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا: اپنے گھر والوں کی خدمت یعنی گھریلو زندگی میں حصہ لیتے تھے اور گھر کا کام بھی کرتے تھے، مثلاً بکری کا دودھ دوہ لینا، اپنے نعلین مبارک سی لینا۔ (زاد المعاد) گھر میں جو کھانا تیار ہوتا حاضر کر دیا جاتا، آپؐ کی مرغوب اور پسندیدہ شئ ہوتی تو تناول فرماتے ورنہ خاموشی اختیار کرتے، لیکن کھانے میں کوئی عیب نہیں لگاتے، دن کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرتے، رات میں عشاء کی نماز کے بعد غیر ضروری جاگنے کو بالکل ناپسند کرتے، آپؐ کا بستر بالکل معمولی ہوتا، بسااوقات چمڑے کا بستر ہوتا اور اس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی اور کبھی چٹرا ہوتا، آپ اسی پر آرام فرماتے۔

متعلقین کے ساتھ حسن سلوک

اقرباء ورشتہ دار، ازواجِ مطہرات، اولاد اور خدام کے ساتھ حسن سلوک کی وجہ تو باہمی تعلق اور عند اللہ مسئولیت کا احساس بھی ہو سکتا ہے، لیکن جو حضرات اس زمرہ میں نہ ہوں، محض دینی رشتہ کی بنا پر رواداری، یگانگت، اور ان کے حقوق کا خیال آپ کو فکر مند رکھتا تھا اور آپؐ ہر مسلمان کو قدرد

(۱) مشکوٰۃ/ ۵۱۸

منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک خاتون مسجد نبوی میں صفائی ستھرائی کی خدمت انجام دیتی تھیں۔ چند دنوں آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو موجود نہیں پایا۔ آپؐ نے لوگوں سے ان کے متعلق دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپؐ نے کہا: تم لوگوں نے مجھ کو اطلاع کیوں نہیں دی؟ دراصل لوگوں نے ان کے معاملہ کو معمولی اور غیر اہم تصور کیا۔ نیز فرمایا: ان کی قبر مجھے بتلاؤ! پھر حضورؐ خود ان کی قبر پر تشریف لے گئے اور نمازِ جنازہ پڑھی(۱) آپؐ کے اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ امت کے احوال اور ان کی دینی و دنیاوی کامیابی کی فکر آپ کو کس قدر فکر مند رکھتی تھی؟

مغربی دنیا میں خاندانی نظام کے بکھراؤ نے لوگوں کو ازدواجی اور عائلی زندگی کے سکون سے محروم کر دیا ہے۔ انسان گھر سے باہر کی دنیا میں جن مشکلات اور دشواریوں دوچار ہو جاتا ہے اپنی خلوتوں کے سکون سے ان الجھنوں کا مداوا کرتا ہے؛ لیکن اگر گھر کا ماحول بھی سکون کے بجائے بے سکونی اور طمانیت و قرار کے بجائے اضطراب کا باعث بن جائے تو پھر کہاں سکون تلاش کیا جائے؛ اس لیے عائی زندگی کی بے سکونی اور اضطراب انسان کے وجود کے لیے ایک ایسا گھن ہے جو اس کے دل ودماغ کو چاٹتی رہتی ہے اور باغ ہو یا صحرا، دل کی دنیا کو بے سکون رکھتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عائلی زندگی کا جو نقشہ بنایا اور خود اس پر عمل کر کے دکھایا، حقیقت یہ ہے کہ وہ عائلی اور ازدواجی زندگی کے لیے بہترین نمونہ اور ہر طرح کی بے سکونی کا علاج اور اکسیر ہے اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے آئینہ میں ہم اپنی گھریلو زندگی کی صحیح صورت گری کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

(۱) مسلم: ۱/۳۱۰

تجارت اور اسوۂ رسول

مولانا احمد عبد المجیب قاسمی ندوی

نظامِ معیشت میں تجارت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، بلکہ معاشی واقتصادی نظام کی ترقی کا راز تجارت ہی میں مضمر ہے۔ اقوامِ عالم کی تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہے کہ کسی قوم کی فلاح و بہبود میں اس کی مضبوط اقتصادی حالت اور مستحکم معاشی نظام کو بڑا دخل ہے، زراعت، صنعت اور تجارت معیشت کے بنیادی ذرائع میں سے ہیں۔ ان کے ذریعہ جو قوم اس میدان میں آگے بڑھتی اور ترقی کرتی ہے، اسے حوصلہ مندی اور خود اعتمادی کی دولت نصیب ہوتی ہے، وہ اس موقف میں ہوتی ہے کہ اپنی زبان، تہذیب، تمدن اور ریاست و حکومت کی خود حفاظت کر سکے اور جو قوم اس معاملہ میں غفلت شعار اور سست رفتار واقع ہوتی ہے، وہ اپنی تہذیبی شناخت اور سیاسی و تمدنی اہمیت ہی نہیں، بسا اوقات مذہبی امتیاز سے تک محروم ہو جاتی ہے۔ خود ہمارے ملک ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط اور اقتدار کے پس پردہ تجارت ہی کا اثر رہا ہے۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بہ کثرت موجود ہیں کہ تجارتی ترقی اور معاشی استحکام نے قوموں کو تختِ اقتدار تک پہنچایا اور مسندِ حکومت پر فائز کیا ہے۔

تجارت کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسلام نے تجارت کی ترغیب دی، اس کی افادیت اور نافعیت کو تسلیم کرتے ہوئے بعض ایسے اصول وضع کیے، جس سے تجارت ترقی اور فروغ پائے، اسے اس قدر خوشگوار اور آسان بنایا کہ ہر سطح کے لوگ اس کی منفعت سے مستفید ہو سکیں، اس باب میں اسلام نے بعض بنیادی اصلاحات بھی کی ہیں، جس سے توازن اور اعتدال کی راہ ہموار ہوئی، اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں مروّج بعض ان تجارتی صورتوں پر سخت نکیر بھی کی ہے، جس سے دولت کا ایسا ارتکاز ہو کہ قومی معیشت کا دیوالیہ نکل جائے اور انسان مال کا حریص اور دولت کا پجاری بن جائے، نیز اسلام نے نفع بخش تجارت کی وہ بنیادیں بھی مقرر کی ہیں جس پر کوئی بھی قوم، معیشت کی مضبوط و

مستحکم عمارت قائم کر سکتی ہے، اس کے یہاں تجارت محض "جہاں میں دو کفِ جو" کے حصول کی جد و جہد اور "ہوائے نفس" کی تکمیل کا نام نہیں، بلکہ وہ عبادت و بندگی بھی ہے اور روح کی تسکین کا سامان بھی؛ اسی لیے اسلام نے اپنے ماننے والوں کو مختلف اسالیب اور پیرایۂ بیان میں تجارت کی ترغیب اور دنیوی و اخروی منافع و برکات کی بشارت سنائی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

" فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ"(۱)

"پھر جب تمام ہو چکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا۔"

نماز جیسی اہم ترین عبادت کے بعد "فضل خداوندی" (رزق اور تجارت) کی تلاش کا ذکر کیا گیا ہے، کہ نماز سے فراغت کے بعد رزقِ حلال اور کسبِ معاش (تجارت) کے لیے نکل سکتے ہو۔ بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ فریضۂ نماز کی ادائیگی کے بعد اہم ترین فرض یہ ہے کہ ایک مسلمان رزقِ حلال اس کے جائز طریقوں سے حاصل کرے۔ اس آیت سے تجارت کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کی تعلیم و تلقین کے مطابق اور حدودِ شرع کی رعایت کرتے ہوئے جو تجارت بھی کی جائے، کہ عین تجارت میں بھی "ذکرِ خداوندی" اور احکامِ شرع کی پاسداری سے غفلت نہ ہو تو وہ تجارت ایک عبادت ہے، قربِ خداوندی کا ذریعہ ہے اور دنیوی و اخروی کامیابی کی ضمانت ہے۔

اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا . (۲)

اللہ نے خرید و فروخت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا۔"

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ۔(۳)

اور ہم نے تم کو جگہ دی زمین میں اور مقرر کر دی اس میں تمہارے لیے روزیاں۔

هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ(۴)

(اور وہی ہے جس نے کام میں لگا دیا دریا کو، کہ کھاؤ اس میں سے گوشت تازہ اور نکالو اس میں سے گہنہ جو پہنتے ہو اور دیکھتا ہے تو کشتیوں کو چلتی ہیں پانی پھاڑ کر اس میں اور اس واسطے کہ تلاش کرو اس کے فضل سے۔)

ان آیات میں اسی "فضل" (رزق اور تجارت) کی تلاش کا ذکر ہے، گویا قرآن نے مستقل

(۱) الجمعۃ: ۱۰ (۲) بقرۃ: ۲۷۵ (۳) الاعراف: ۱۰ (۴) نحل: ۱۴

طور پر حیاتِ انسانی کے اس اہم ترین پہلو (کسبِ معاش اور طلب رزق) کی طرف متوجہ کیا ہے، تاکہ انسان مختلف ذرائع سے رزق کے انتظام میں متحرک رہے اور اس کے لیے ممکنہ تدبیر وسعی سے گریز نہ کرے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض علماء نے زراعت و کاشت کاری کو بہترین ذریعۂ معیشت قرار دیا ہے۔ علامہ ماوردی کی رائے یہی ہے، کیوں کہ زراعت سے وابستہ لوگوں میں زیادہ توکل اور اخلاص و تسلیم وانقیاد ہوتا ہے، بعض لوگوں نے کہاکہ صنعت و حرفت بہترین ذریعۂ معیشت ہے، کہ اس میں زیادہ محنت اور مشقت ہوتی ہے اور بعض علماء جیسے امام شافعیؒ وغیرہ کا خیال یہ ہے کہ تجارت زیادہ بہتر ذریعۂ معاش ہے۔ قرآن وحدیث کی بعض نصوص سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے۔ غور کیجئے کہ زراعت و صنعت کو بھی تجارت کی احتیاج ہے، کہ بغیر تجارت غلہ، اناج اور مصنوعات کی عام انسانوں تک رسائی ناممکن ہے ؛ لیکن صحیح بات تو یہ ہے کہ زمانہ اور لوگوں کے حالات کے اعتبار سے فرق ہے، کسی زمانہ میں صنعت کی اہمیت ہے تو اس کی فضیلت ہے اور کسی علاقے میں تجارت کی اہمیت زیادہ ہے تو اس لحاظ سے وہ افضل ہے۔ مقصود یہ ہے کہ کسبِ معاش کے ذرائع میں حلال و حرام حدود کو باقی رکھا جائے۔

تجارت میں آدمی قدم قدم پر آزمائش سے دوچار ہوتا ہے، اس میں ورع و تقویٰ کی تعلیم ہے اور حلال وحرام کی تمیز اور شبہات سے بچنے کی تلقین۔ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ سے کسی نے کہاکہ آپ زہد و تقویٰ کے سلسلہ میں کوئی کتاب کیوں تصنیف نہیں کردیتے؟ انہوں نے کہا : "صنفت کتاب البیوع" میں نے خرید و فروخت کے طریقہ پر ایک کتاب تصنیف کردی ہے۔ معلوم ہوا کہ تقویٰ و پرہیز گاری یہ ہے کہ آدمی حرام سے بچے اور حلال ذریعہ سے رزق حاصل کرے۔

کسبِ معاش

کسبِ معاش، زندگی کی بنیادی ضروریات اور نفسانی و جسمانی تقاضوں کی تکمیل کیلئے ضروری ہے؛ اسی لیے اسلام کے نزدیک اسے عبادت کا درجہ حاصل ہے، جس طرح نماز وروزہ اور ذکر و تسبیحات عبادت ہیں، اسی طرح حلال روزی کے لیے تپتی ہوئی دھوپ میں محنت و مزدوری بھی عبادت ہے، رات کی تاریکی میں خدا کی یاد عبادت ہے، تو دن کے اجالے میں خدا کی زمین میں پھیل کر خدا کا فضل تلاش کرنا بھی عبادت ہے، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا و مناجات عبادت ہے تو پاک رزق کے لیے زمین سے لکڑیاں جمع کرنے، کاشت کرنے، یا کسی محنت و مزدوری میں ہاتھ کا کھردرا ہونا بھی بندگی ہے، اسلام زندگی بھی ہے اور بندگی بھی، اس کے یہاں دین اور دنیا کی کوئی تقسیم نہیں، حکم

خداوندی کی رعایت کے ساتھ انجام پانے والا ہر عمل عین دین ہے، خواہ اس کا تعلق جسم سے ہو کہ روح سے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ رات کی تاریکی کو ہم نے لباسِ راحت بنایا ہے اور دن کا اجالا اور روشنی اس لیے ہے کہ تلاشِ معاش میں سہولت ہو (وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا) پھر اس کیلئے حالات اور ضرورت کے اعتبار سے سفر درپیش ہو تو اسکی بھی حوصلہ افزائی فرمائی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی اہمیت و فضیلت کی مختلف انداز سے تعبیر و تفہیم فرمائی ہے، یہاں تک کہ آپؐ نے سچے اور امانت دار تاجر کے بارے میں فرمایا کہ اس کا حشر انبیاء صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا (ترمذی عن ابی سعید الخدری، باب ماجاء فی التجار، کتاب البیوع)، آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ طلبِ معاش کی فکر بعض گناہوں کا کفارہ ہے (احیاء مع الاتحاف ۶ / آداب الکسب والمعاش)، آپؐ نے فرمایا: ''جو شخص حلال طریقہ سے دنیا کا طلب گار ہو، دستِ سوال دراز کرنے سے گریز کرتا اور اپنے اہل و عیال کی روزی کے حصول میں جدوجہد کرتا ہو تو روزِ قیامت خدا سے وہ اس حال میں ملے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہوگا، (احیاء العلوم مع الاتحاف) آپ کا ارشاد ہے: ''بہتر آدمی کے لیے مالِ حلال بہتر شئ ہے''، (مجمع الزوائد، باب اتخاذ المال ۴ / ۶۴) آنحضورؐ نے ایک شخص کے ہاتھ کو بوسہ دیا، جس کی ہتھیلیاں محنت و مشقت کی وجہ سے سخت ہو گئی تھیں۔

جو شخص اپنے اہل و عیال کے لیے سامانِ راحت اور روزی کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچتا ہے تو وہ ایک مجاہد کا اجر پائے گا۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے گذرا، جو جسمانی اعتبار سے تندرست اور مضبوط ہاتھ پاؤں کا تھا، صحابہؓ نے عرض کیا: ایسا شخص کاش جہاد میں شریک ہوتا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر یہ شخص اپنے بچوں کی پرورش کے لیے حلال طریقہ سے روزی کی تلاش میں نکلا ہے تو یہ بھی اللہ کے راستے میں اس کا جہاد ہے اور اگر اس لیے نکلا ہے کہ اتنی روزی اپنی محنت اور مزدوری سے حاصل کرلے، کہ لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے تو یہ بھی جہاد ہے؛ ہاں اگر دکھاوے اور نمائش کے لیے نکلا ہے تو وہ شیطان کی راہ میں ہے۔ (الترغیب والترہیب عن کعب بن عجرہؓ ۳ / ۵۲۴)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسبِ معاش کے سلسلہ میں جہاں ترغیب دی ہے، وہیں اس میں اعتدال اور میانہ روی کی بھی ہدایت دی ہے۔ مال اور دولت کی حرص و طمع بری چیز ہے، اس سے انسان کو کبھی آسودگی اور چین نصیب نہیں ہوتا، پھر مال کی کثرت، اخلاقی و تہذیبی بے راہ روی کا

سبب بنتی ہے، حلال وحرام کی تمیز رہتی ہے، نہ اچھے اور برے کی شناخت باقی رہتی ہے ؛اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : "دولت کثرت کا نام نہیں، بلکہ قلب کے استغناء کا نام ہے، جو کچھ مقدر میں ہے، وہ مل کر رہے گا، اس لیے طلبِ معاش میں اعتدال سے کام لو۔" (مجمع الزوائد : ۴/۱۷) غزوۂ تبوک کے موقع سے آپؐ نے خطبہ دیتے ہوئے خصوصیت سے اس کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ جیسے موت انسان تک پہنچ کر رہتی ہے، اسی طرح رزق انسان تک پہنچ کر رہتا۔ (حوالۂ سابق) قرآن مجید میں ان لوگوں کی تعریف وتوصیف آئی ہے جن کے لیے تجارت اور کاروبارِ دنیا نماز وروزہ اور ذکرِ الٰہی کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی تھی، رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ (نور : ۳۷) (وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سوداگری کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے) اسی پس منظر میں حدیث میں بازاروں کو خراب جگہ قرار دیا گیا ہے، اَبْغَضُ الْبُقَاعِ اِلَى اللّٰهِ الْاَسْوَاقُ . (تخریج عراقی علی حدیث احیاء)

تجارت کی فضیلت

تجارت کی فضیلت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت فرمائی ہے اور تجارت کو بہترین ذریعۂ معاش قرار دیا ہے۔ ایک مرتبہ آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بہتر ذریعۂ معاش کیا ہے؟ ارشاد ہوا صحیح طریقہ پر تجارت اور اپنے ہاتھ کی محنت۔ (مجمع الزوائد عن رافع بن خدیج ۴/۶۰) صحابۂ کرام کی ایک بڑی تعداد بھی پیشۂ تجارت سے وابستہ تھی، اس کے بعد سلفِ صالحین میں بھی ذوقِ تجارت پایا جاتا رہا ہے۔ تجارت میں خیر وبرکت کے جو سرچشمے ہیں اور ذرائع رزق میں اس کی جو اہمیت ہے، اس کا اندازہ اس حدیث سے ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : "تجارت اختیار کرو کہ انسان کی روزی کے نو حصے تجارت میں ہیں، یعنی ۹/۱۰ ذرائع رزق (تسعۃ اعشار) تجارت کے ذریعہ ملتے ہیں۔ (کنز العمال ۲/ ۱۹۲) مسلمان اگر زبانِ نبوت کی اس حقیقت پر غور کریں اور صحیح اسلامی طریقہ پر تجارت کریں، تو آج بھی وہ تجارت کی ان برکات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ آپ کا یہ ارشاد بھی ہے : "اگر یہ تجارتیں نہ ہوتیں تو تم لوگوں پر بوجھ بن جاتے۔" (کنز العمال، باب الکسب)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی جہاں فضیلت بیان فرمائی ہے، وہیں آپؐ نے اپنے ارشادات اور ہدایات کے ذریعہ تجارت میں مروج بعض نقائص اور عملی کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی اور ان کی اصلاح بھی فرمائی۔ زیرِ نظر مضمون میں تجارت کے سلسلہ میں تعلیماتِ نبویؐ اور اس

کے اخلاقی پہلو پر روشنی ڈالی جائے گی۔

آپ ﷺ نے سب سے پہلے کاروبار کرنے والوں کے لیے بہتر نام "تاجر" کا تجویز فرمایا، کیوں کہ اسلام سے پہلے لوگ تاجر کو "سمسار" یعنی "دلال" کہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ ایک قبیح تخاطب تھا، (ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی التجار) نیز چوں کہ اس پیشہ میں جھوٹ، دھوکہ دہی اور خیانت کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں، اس لیے تنبیہ فرمائی کہ جو تجار بے خوف، جھوٹے اور بد معاملہ ہوں، وہ قیامت میں فاجروں کی صورت میں اٹھائے جائیں گے۔ (ترمذی کتاب البیوع)

امانت اور سچائی

سچائی اور امانت کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، اسلام زندگی کے ہر موڑ پر ان دونوں اعلیٰ اوصاف کی تعلیم دیتا ہے، تجارت میں اس کا لحاظ نہایت ضروری ہے، بلکہ کامیاب اور نفع بخش تجارت کی "کلید" ہیں۔ یہ روایت گذر چکی ہے کہ: "سچا اور امانت دار تاجر، انبیاء، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہوگا۔" (ترمذی عن ابی سعید الخدریؓ) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "سچ بولنے والا تاجر، قیامت میں عرش کے سایہ میں ہوگا۔" (الترغیب ۳/۵۸۵)

حقیقت یہ ہے کہ تجارت سچائی اور امانت سے بابرکت ہوتی ہے اور جھوٹ سے اس کی خیر و برکت کی روح جاتی رہتی ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: "قیامت کے روز خدا تعالیٰ نہ اس شخص سے بات کرے گا، نہ اس کی طرف منہ اٹھا کر دیکھے گا اور نہ اس کو پاک وصاف کر کے جنت میں داخل کرے گا جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے کاروبار کو فروغ دینے کی کوشش کرتا ہے۔" سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنی تجارتی زندگی میں زیادہ قسمیں کھانے سے پرہیز کرو، کیوں کہ تجارتی معاملات میں زیادہ قسمیں کھانا، پہلے تو کاروبار کو رواج دیتا ہے، مگر پھر برکت کو کھو دیتا ہے۔ (مشکوٰۃ عن ابی قتادۃ)

تجارت میں باہمی رضامندی

تجارت کی بنیاد باہمی رضامندی پر ہے، بلکہ اسلام کا مزاج تمام ہی معاملات میں یہ ہے کہ فریقین آزادانہ طور پر اپنے معاملہ کو طے کریں، اس میں جبر واکراہ کی کوئی بھی صورت اسلام کی نگاہ میں ناپسند اور ممنوع ہے۔ تجارت میں باہمی تعاون کا جذبہ اور رضامندی، تجارت کو نتیجہ خیز اور نفع بخش بناتی ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہر دو فریق کو ایسی آزادی اور اختیار حاصل رہے کہ دوسرے کے لیے وہ نقصان کا سبب نہ بنے؛ چنانچہ قرآن حکیم میں یہ حکم موجود ہے:

لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء: ۲۹)

(اپنے مال کو باہم باطل طریقے پر مت کھاؤ سوائے اس کے کہ وہ اپنی رضامندی سے تجارت ہو۔)

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ باہمی رضامندی تجارت کا بنیادی اصول ہے۔ اسی مفہوم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے: اِنَّمَا الْبَیْعُ عَنْ تَرَاضٍ (رواہ البیہقی وابن ماجہ عن ابی سعید الخدریؓ)، ''خرید وفروخت، تو رضامندی سے ہوتی ہے۔'' اسلام سے پہلے جاہلیت میں ''ملامسہ'' اور ''منابذہ'' کے نام سے خرید وفروخت کے دو طریقے رائج تھے، منابذہ کی صورت یہ تھی کہ فروخت کرنے والا سامان کو خریدار کی طرف بڑھا دیتا تھا اور اسی عمل سے خرید وفروخت مکمل سمجھی جاتی تھی اور ملامسہ کی شکل یہ تھی کہ معاملہ کرنے کے وقت خریدار سامان کو اپنے ہاتھ سے چھو دیتا تھا اور اسی عمل سے خرید وفروخت کی تکمیل ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے ان دونوں بیع میں رضامندی کے بغیر بیع کو لازم قرار دیا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منابذہ اور ملامسہ دونوں سے منع فرمایا۔ (ترمذی عن ابی ہریرۃ) اسی طرح ایک طریقہ ''بیع حصاۃ'' کا بھی تھا، اس کی صورت یہ تھی کہ خریدار سامان کی طرف کنکری پھینکتا، جس سامان پر کنکری گرتی، اس کی فروختگی عمل میں آجاتی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکری کے ذریعہ ہونے والی اس خرید وفروخت سے منع فرمایا۔ (حوالہ سابق) مذکورہ بیوع (خرید وفروخت) میں غیر منصفانہ جاہلی تصور کے علاوہ غرر اور دھوکہ بھی ہے، نتیجہ غیر واضح اور مبہم ہے اور ایک طرح سے ''قمار'' کی شکل میں بھی داخل ہے، اس لیے شرعی طور پر ان سے منع کیا گیا ہے۔

عیب چھپایا نہ جائے

سامانِ فروخت میں اگر کوئی عیب ہو، تو اس کا چھپانا اور خریدار پر واضح نہ کرنا شرعی واخلاقی دونوں اعتبار سے ناپسندیدہ عمل ہے، بلکہ خریدار کے ساتھ یہ ایک خیانت اور فریب ہے۔ ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم غلے کے ایک ڈھیر کے پاس سے گذرے، آپ نے اپنا ہاتھ اس ڈھیر میں ڈالا، تو انگلیوں میں کچھ تری محسوس ہوئی، آپ نے غلہ والے سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ تاجر نے عرض کیا کہ بارش میں بھیگ گیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ پھر اس بھیگے ہوئے دانے کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ اسے دیکھ سکیں؟ جو شخص دھوکہ دے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں، ''مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنَّا'' (ترمذی کتاب البیوع، باب فی کراھیۃ الغش فی البیوع)

حضرت جریر رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے اور جانے لگے تو کپڑا پکڑ کر کھینچا اور فرمایا کہ

ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی اور بھلائی سوچنا! "اَلنُّصْحُ لِکُلِّ مُسْلِمٍ" اس نصیحت کا اثر ان پر اس قدر ہوا کہ ان کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی سامان فروخت کرتے تو عیب زدہ حصہ سامنے رکھ دیتے اور خریدار کو اختیار دیتے کہ چاہے تو لے اور چاہے تو چھوڑ دے (اتحاف مع الاحیاء ۶ / ۷۷ ۳) حضرت واثلہؓ بن اسقع کے متعلق مروی ہے کہ ایک شخص نے تین سو دینار میں اونٹنی فروخت کی، پھر ابھی وہ شخص نکلا ہی تھا آپؓ نے چیخ کر آواز دی اور دریافت فرمایا کہ اونٹنی کس چیز کے لیے لیے ہو؟ انہوں نے کہا کہ سواری کے لیے۔ حضرت واثلہؓ نے فرمایا کہ اس کے کھر میں سوراخ ہے اور وہ تیز نہیں چل سکتی۔ اس شخص نے اونٹنی واپس کر دی اور بیچنے والے نے سو درہم کمی کر دی۔ تاجر، واثلہؓ سے کہنے لگا کہ آپ نے میرے معاملہ کو خراب کر دیا۔ حضرت واثلہؓ نے فرمایا کہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ : کسی سامان کو بیچنا جائز نہیں، جب تک کہ اس کی خامی کا اظہار نہ کر دیا جائے اور جو کوئی اس خامی سے واقف ہو، اس پر بھی اس خامی کا اظہار واجب ہے۔ (حوالۂ سابق) آپؐ کا یہ ارشاد بھی قابل توجہ ہے کہ : "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، کسی مسلمان کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ کسی سامان کا عیب (بشرطیکہ اس میں ہو) بیان کیے بغیر اپنے بھائی سے فروخت کر دے، اگر کوئی شخص عیب کو چھپائے، یہاں تک کہ خریدار بعد میں اس عیب سے مطلع ہو جائے تو خریدار کو اس معاملہ کو باقی رکھنے یا ختم کر دینے کا اختیار حاصل رہتا ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کو "خیارِ عیب" کہتے ہیں۔

ذخیرہ اندوزی

اسلام سے پہلے تجارت میں جو بعض بدعنوانیاں اور ضرر رساں چیزیں پائی جاتی تھیں، ان میں "احتکار" (ذخیرہ اندوزی) بھی ہے اور آج بھی یہ عمل کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ "احتکار" کا مفہوم یہ ہے کہ اشیاءِ ضروریہ کی ذخیرہ اندوزی اور بازار میں اس کی مصنوعی قلت پیدا کی جائے، تاکہ قیمتیں بڑھ جائیں۔ اسلام کے قانونِ تجارت میں یہ بات ناپسند ہے، کہ اس سے مہنگائی بڑھتی ہے اور عام آدمی پر اس کا زبردست بوجھ پڑتا ہے ؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ : "ذخیرہ اندوزی کرنے والا گنہگار ہے۔" (ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی الاحتکار) ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا : "ذخیرہ اندوزی کرنے والا کیسا برا آدمی ہے، جب خدا چیزوں کو سستا فرما دیتا ہے، تو وہ غم میں گھلتا ہے اور جب قیمتیں بڑھ جاتی ہیں، تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔" (الترغیب ۳ / ۵۸۳ ذکرہ رزین فی جامعہ) ایک روایت میں ہے کہ جس نے چالیس دنوں احتکار کیا اس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہے۔ (حوالۂ سابق) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص پر

لعنت بھیجی جو مسلمانوں کے غلہ کی ذخیرہ اندوزی کرے، ایسے شخص کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ اللہ اس کو جذام اور افلاس (فقر) میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

کن چیزوں میں ذخیرہ اندوزی، احتکار کی ممنوعہ صورت میں داخل ہے؟ اس میں فقہاء کی مختلف آرا ہیں: امامِ ابو حنیفہؒ کے نزدیک تمام ہی اشیاء میں ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے اور یہی رائے مالکیہ کی بھی ہے۔

تجارت کی کچھ ممنوعہ صورتیں

خرید و فروخت کی وہ تمام صورتیں جن میں مستقبل میں نزاع اور جھگڑے کا امکان ہو، شریعت نے اس سے منع کیا ہے، چنانچہ ایسی چیز جو آدمی کے قبضہ میں نہ ہو یا معاملہ کے وقت موجود نہ ہو، کو بیچنے سے منع فرمایا (ترمذی، کتاب البیوع، باب ما جاء فی کراھیۃ بیع مالیس عندہ) کیوں کہ مستقبل میں یہ چیز فریقین کے درمیان اختلاف اور نزاع کا باعث بن سکتی تھی، اسی طرح ضروری ہے کہ سامان اور قیمت اچھی طرح متعین ہو جائے، کوئی ابہام یا جہالت باقی نہ رہے (مسلم، کتاب البیوع، باب تحریم بیع صبر التمر المجہولۃ الخ) اگر سامان ادھار ہو، تب تو ضروری ہے کہ اس سامان کی جنس، اس کے اوصاف، مقامِ ادائیگی اور مدت وغیرت تمام متعلقات پوری طرح متعین کر دیئے جائیں (مسلم ۲/۳۱) اسی طرح سامان فروخت سے غیر متعین اور مبہم استثناء سے منع کیا گیا ہے (ہدایہ: ۳/۱۱) اگر مختلف قسم کے سکوں کا یکساں رواج ہے تو قیمت میں سکوں کی تعیین ضروری قرار دی گئی، نزاع کو روکنے کے لیے جو پیش بندی کی گئی ہے اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ معاملۂ خرید و فروخت اس وقت تک قطعی اور مکمل نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ خریدار اس کو دیکھ نہ لے، اسی کو اصطلاحِ فقہ میں "خیارِ رؤیت" کہتے ہیں، معاملہ کے نفع و نقصان کو اچھی طرح پرکھ لینے کے لیے تین دنوں کی خصوصی مہلت دی گئی، جو فریقین میں سے ہر ایک دوسرے سے حاصل کر سکتا ہے، اس کو اصطلاح میں "خیارِ شرط" کہا جاتا ہے۔

تجارت میں اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ باہمی محبت، رضامندی، ایک دوسرے کی خیر خواہی اور جذبۂ تعاون و ہمدردی ہو، اس سے بھائی چارگی، انسانیت اور محبت و ہمدردی کی فضا قائم ہو گی اور تجارت میں برکت اور ترقی ہو گی، لیکن جہاں حسد اور رقابت کے جذبات پیدا ہو جائیں تو پھر ترقی کا عمل رک جاتا ہے اور منزلِ مقصود سے دوری بڑھتی جاتی ہے۔ اس سلسلہ کی دو صورتوں کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے، ایک "سوم علی سوم اخیہ" کہ ایک شخص کسی قیمت پر خریداری کا معاملہ طے کر رہا ہو کہ دوسرا شخص آپہنچے اور اس سے زیادہ قیمتِ خرید کی پیشکش کر دے اور دوسرے "بیع علی

بیع انجیہ"، اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کوئی چیز بیچ رہا ہو کہ دوسرا شخص اس سے کم قیمت میں وہی سامان دینے کی پیش کش کرے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں باتوں سے منع فرمایا ہے (فتح الباری: ۴/ ۳۷۳، بخاری عن ابن عمر) کہ اس سے باہم تعلقات متاثر ہوتے ہیں اور رقابت اور حسد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے؛ تاہم یہ ممانعت اسی وقت ہے جب کہ سامان کے خریدنے یا بیچنے کی طرف اس دوسرے شخص کا میلان ہو چکا ہو (عمدۃ القاری ۱۰/ ۳۶۰) اس میں وہ صورت بھی مستثنیٰ ہے جس میں ایک شخص زیادہ سے زیادہ قیمت کے حصول کے لیے بولی لگاتا ہے اور خود آپؐ سے اس طرح خرید و فروخت ثابت ہے۔ (ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی من یزید، فقہ السنۃ ۳/ ۱۲۵)

تجارت میں یہ صورت بھی ممنوع ہے کہ ایک معاملۂ بیع کو دو معاملۂ بیع بتادیا جائے (ترمذی) (مصنف ابن ابی شیبۃ عن ابن عباس)، مثلاً سامان کی نقد قیمت سو روپے ہے اور ادھار دو سو روپے ہے اور معاملہ کسی ایک قیمت پر طے نہ ہو، یہ درست نہیں؛ تاہم اگر خریدار نے دونوں قیمتوں "نقد اور ادھار" میں سے کسی ایک قیمت پر معاملہ طے کر لے تو معاملہ درست ہوگا۔

خرید و فروخت میں کوئی ایسی شرط لگادی جائے جو تقاضۂ خرید و فروخت کے خلاف ہو، تو یہ بھی درست نہیں، مثلاً عقدِ بیع کے بعد خریدار سامان کا مکمل طور پر مالک ہو جاتا ہے کہ اس میں جو چاہے تصرف کرے، لیکن اگر بیچنے والا کوئی ایسی شرط لگادے جس سے اس خریدار کے حق تصرف پر تحدید عائد ہوتی ہے تو یہ نامناسب شرط ہے اور معاملہ فاسد ہو جاتا ہے؛ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ شرط لگانے سے منع فرمایا ہے (رواہ الطبرانی عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ) تاہم فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شرط عرف و رواج کا درجہ حاصل کر لے تو پھر معاملہ کے ساتھ ایسی شرط مقرر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (عالمگیری ۳/ ۱۳۳)

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ دیہات سے اپنا مال غلہ وغیرہ شہر میں لاکر فروخت کرتے ہیں۔ شریعت کا منشاء یہ ہے کہ یہ لوگ اپنا مال بازار میں لاکر خود فروخت کریں، کہ اس سے سامان کسی قدر سستے داموں فروخت ہوگا اور لوگوں کے لیے سہولت ہوگی، تاجر شہر سے نکل کر باہر ہی دیہات سے آنے والے سامان کو خرید لے تو اس صورت میں قوی امکان ہے کہ اہل شہر کو بالواسطہ سامان پہنچنے کی وجہ سے اس کی قیمت میں اضافہ ہو جائے، پھر گرانی بڑھنے لگے۔ اس کو حدیث میں "تلقی جلب" کہتے ہیں۔ آپؐ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم ۲/ ۴) بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جو حقیقتاً خریدار نہیں ہے مگر خریدار کی صف میں آکر سامان کی قیمت لگاتا اور کچھ اضافہ کرتا ہے اور

مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصل خریدار بھی زیادہ قیمت لگائیں، تاکہ سامان کی قیمت زیادہ سے زیادہ حاصل ہوسکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا، کیوں کہ یہ دھوکہ اور خریدار کو ضرر پہنچانا ہے۔ (ابن ماجہ: ۱۵۷)

تجارت، ذکرِ الٰہی سے غافل نہ رکھے

قرآن حکیم کی آیت ہے:

اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ. (الجمعہ: ۹)

(جب اذان ہو نماز کی جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کی یاد کو اور چھوڑ دو خرید و فروخت۔)

اس آیت میں ذکر تو روزِ جمعہ کا ہے، لیکن حکم عام ہے کہ ہر نماز اور عبادت کے لیے خاص اہتمام کیا جائے۔ شریعت نے اس تجارت سے منع کیا ہے جو عبادت میں خلل اندازی کا ذریعہ بنے۔ بے شک تجارت ایک عبادت ہے، معاشی جد و جہد باعثِ ثواب امر ہے، دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ کی کمائی کھائے، تجارت اور کسبِ معاش کی فضیلت دین و آخرت دونوں کے اعتبار سے ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ تجارت میں "ذکرِ الٰہی" کا بھی حصہ شامل رہے؛ جس کا مفہوم یہ ہے کہ نماز اپنے پر وقت پر ادا ہو، تلاوت و ذکر سے غفلت نہ ہو، حلال و حرام کا شعور و احساس ہو اور تجارت احکامِ شرع کی پابند ہو، ورنہ پھر تجارت، برکت نہیں، خسران اور نقصان کا موجب ہے۔ صحابہؓ کرامؓ نماز کے وقت اپنی تمام تجارتی مصروفیات ترک کر کے اللہ کی عبادت کے لیے مسجد کا رُخ کرتے تھے، "ذکرِ الٰہی" کے مقابلہ میں وہ کسی بڑے دنیوی فائدہ کا بھی خیال نہیں کرتے تھے۔ قرآن میں ان کی یہ صفت بیان ہوئی ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ اِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ (النور: ۳۷)

وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے جس میں الٹ جائیں گے دل اور آنکھیں۔

اسی پس منظر میں یہ واقعہ بھی بڑا عبرت خیز اور فکر انگیز ہے کہ عہدِ رسالت میں دو صحابیؓ تھے، ایک تجارت کرتے تھے اور دوسرے صنعت و حرفت (یعنی لوہار) سے وابستہ تھے اور تلواریں بنا کر بیچتے تھے، پہلے صحابیؓ کی تجارت کا یہ حال تھا کہ اگر سودا تولتے وقت اذان کی آواز کان میں پڑتی تو وہیں ترازو کو پٹک کر نماز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے، دوسرے صحابیؓ کا یہ حال تھا کہ اگر گرم لوہے پر ہتھوڑے کی

ضرب لگا رہے ہوں اور کان میں اذان کی آواز آ گئی تو اگر ہتھوڑا مونڈھے پر اٹھائے ہوئے ہیں، تو وہیں مونڈھے کے پیچھے ہتھوڑا ڈال کر نماز کو چل دیتے تھے، اٹھائے ہوئے ہتھوڑے کی ضرب سے کام لینا بھی گوارا نہ تھا۔ (قرطبی)

اسی طرح مساجد میں خرید و فروخت سے روکا گیا ہے ؛ کیوں کہ مساجد اللہ کا گھر، نماز و ذکر اور دعوت و عبادت کی جگہ ہے، اس لیے مسجد میں خرید و فروخت سے اندیشہ ہے کہ دوسروں کی نماز اور عبادت میں خلل ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

اِذَا رَاَیْتُمْ مَنْ یَبِیْعُ اَوْ یَبْتَاعُ فِی الْمَسْجِدِ فَقُوْلُوا لَا اَرْبَحَ اللّٰهُ تِجَارَتَكَ

(مسجد میں کسی کو خرید و فروخت کرتا دیکھو تو کہہ دو کہ خدا تمہاری تجارت کو نفع سے محروم کر دے۔) (ترمذی، کتاب البیوع، باب النہی عن البیع فی المساجد)

خوش خلقی اور وعدہ کی پابندی

معاملات میں انسان کو نرم خو اور خوش خلق ہونا چاہیے، دیانت، امانت، ایثار اور وعدہ کی پابندی میں مثالی کردار ادا کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "خدا اس شخص پر رحم کرے جو خرید و فروخت اور تقاضا کرنے میں نرمی اور خوش اخلاقی سے کام لیتا ہے۔ (بخاری عن جابر بن عبداللہ) ایک طرف آپؐ نے خریدار کو تنبیہ فرمائی کہ قیمت کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا اور بائع کو پریشان کرنا ظلم ہے "مَطلُ الغَنِیِّ ظُلمٌ" (بخاری عن ابی ہریرۃ، کتاب الحوالات) اور دوسری طرف بائع (بیچنے والا) کو ہدایت دی کہ وہ تقاضا کرنے میں نرمی اختیار کرے، ہر چند کے بائع کو مدت پوری ہو جانے کے بعد اپنے بقایا کے سلسلہ میں سختی کے ساتھ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے، تاہم تعلیم ہوئی یہ ہے کہ اس بات کی رعایت کی جائے کہ ممکن ہے وہ ادائیگی کے موقف میں نہ ہو یا کوئی مجبوری ہو۔ اسی بنا پر آپ نے فرمایا کہ ایک شخص سے موت کے وقت فرشتہ نے پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی نیکی ہے؟ وہ بولا کوئی اور نیکی تو نہیں، البتہ میں ادھار خرید و فروخت میں تنگ دست کو ادائیگی مہلت دیتا تھا۔ یا اس کو بالکل چھوڑ دیتا تھا اور معاف کر دیتا تھا اور تقاضا میں نرمی برتتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس نیک عمل کے بدلے جنت میں داخل کر دیا۔ اور فرمایا کہ جب وہ لوگوں سے درگذر کرتا تھا، تو میں اس سے زیادہ درگذر کرنے والا ہوں۔ (مشکوٰۃ / ۲۴۳)

تجارت میں ایفاءِ عہد کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ قرآن و حدیث میں انسانوں کو جو ضابطہ اخلاق عنایت کیا ہے، اس میں ایفاءِ عہد پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ نیز معاملات میں اس کی رعایت نہ ہو تو

باہمی روابط اور تعلقات میں تکدر پیدا ہوتا ہے۔ قیمت ادا کرنے کی قدرت کے باوجود ٹال مٹول کرنے اور وعدہ خلافی کو آپ نے ظالمانہ عمل قرار دیا۔

تجارت میں دیانت اور ایمان داری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ناپ تول میں کمی نہ کی جائے۔ قرآن وحدیث میں جا بجا یہ تعلیم موجود ہے کہ ناپ تول پورا کیا جائے۔ سوید بن قیسؓ سے مروی ہے کہ میں اور ایک صاحب کپڑا فرخت کر رہے تھے، آپؐ تشریف لائے، پاجامہ خرید فرمایا، میرے پاس ایک شخص تھا، جو قیمت تولنے اور وزن کرنے پر مامور تھا، آپؐ نے قیمت ادا کرتے ہوئے فرمایا: جھکا کر تولو "زنْ و ارْجح" (ابوداؤد، کتاب البیوع باب الرجحان فی الوزن) یعنی وزن میں کچھ زیادتی ہو کمی نہ ہو۔ ناپ تول کے پیمانے والوں سے فرمایا: کہ تم لوگ دو ایسی چیزوں کے ذمہ دار بنائے گئے ہو جس میں اس سے پہلے کی امتیں ہلاک ہو چکی ہیں۔ (ترمذی: کتاب البیوع) آپ کا یہ بھی ارشاد ہے: کہ جس قوم میں ناپ تول میں کمی کی عادت عام ہو جائے اللہ تعالیٰ رزق کے دروازے اس پر بند کر دیتے ہیں۔ (الترغیب ۳/۵۶۹)

تاجروں کے لیے بعض نبوی ہدایت

تجارت میں وقت کی پابندی اور خصوصیت کے ساتھ صبح کے وقت میں طلبِ رزق کے لیے سعی خیر و برکت کا موجب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "رزق کی تلاش اور حلال کمائی کے لیے صبح سویرے ہی چلے جایا کرو، کیوں کہ صبح کے کاموں میں برکت اور کشادگی ہوتی ہے۔" اور بھی حدیثوں سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ یقین و ایمان کی کیفیت کے ساتھ اگر مسلمان آج بھی اس پر عمل پیرا ہوں تو وہ عظیم برکات سے مالامال ہو سکتے ہیں۔

تجارت میں ہر قدم پر آدمی آزمایا جاتا ہے، حلال کمائی حاصل کرنے کے لیے، محنت و مشقت اختیار کرنی پڑتی ہے، پھر بھی ممکن ہے کہ دینی و شرعی نقطۂ سے کچھ کوتاہیاں سرزد ہو جائیں، اس لیے آپؐ نے حکم دیا کہ خدا کی راہ میں صدقہ و خیرات بھی کیا کرو۔ ارشاد نبویؐ ہے:

"اے کاروبار کرنے والو! مال کے بیچنے میں لغویات کرنے اور جھوٹی قسم کھانے کا بہت امکان رہتا ہے، تم لوگ اپنے مالوں سے صدقہ ضرور دیا کرو، آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ: "شیطان اور گناہ خرید و فروخت کے وقت حاضر رہتے ہیں، اپنے معاملاتِ خرید و فروخت میں صدقہ شامل کر لو، اس لیے کہ صدقہ غضبِ الٰہی کو بجھاتا ہے۔ (ترمذی)

☆☆☆

مشترکہ کاروبار
نبوی ہدایات کی روشنی میں

مفتی محمد مصطفیٰ مفتاحی

دنیا میں انسان کی جو مادّی ضرورتیں ہیں، ان کی تکمیل کے لیے مال واسباب کا ہونا ضروری ہے، مال واسباب کے بغیر ضرورتوں کی تکمیل نہیں ہوتی ؛ اس لیے فطری طور پر ہر انسان کو مال کے حصول کی خواہش ہوتی ہے۔ قرآن نے بھی مال کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے، بلکہ اسے معاش کا مدار قرار دیا ہے (نساء : ۵) اور اس کے حصول کی اجازت عطا فرمائی ہے (جمعہ : ۱۰) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مال حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے، بلکہ محنت کی کمائی کو افضل اور برتر قرار دیا ہے، ساتھ ہی مال کے حصول کی تگ ودو میں احتیاط واعتدال ملحوظ رکھنے کی بھی ہدایت فرمائی ہے۔ فرمایا ہے کہ مال کو احسن طریقہ سے طلب کرو، حلال مال لے لو اور حرام کو چھوڑ دو۔(۱)

انسان کو جو مال حاصل ہوتا ہے، اس کے ذرائع چار ہیں :

حکومت، ملازمت، زراعت، اور تجارت

حکومت ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ مال حاصل کرتی ہے، ملازمت میں صلاحیت و محنت صرف کرنے کے عوض میں مال ملتا ہے، زراعت میں زمین پر محنت کر کے پیداوار حاصل کی جاتی ہے، تجارت میں کوئی مادّی شئے دے کر اس کے معاوضہ میں مال حاصل کیا جاتا ہے۔

فی زمانہ کچھ عیار لوگوں نے جواز وعدمِ جواز اور عزت وذلت سے قطع نظر کرتے ہوئے مال کے حصول کی پانچویں شکل دریافت کرلی ہے اور باضابطہ اسے ایک پیشہ کی حیثیت دے دی ہے اور وہ ہے گداگری ؛ لیکن بلا ضرورتِ شرعی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کو نہ صرف اسلام نے

(۱) ابن ماجہ : /۱۵۵

مذموم قرار دیا ہے، بلکہ طبع سلیم بھی قابل نفرت قرار دیتا ہے ، کیوں کہ یہ انسانی مقام و وقار سے فروتر بات ہے ؛اس لیے یہ پانچویں شکل بالکل لائق اعتناء نہیں ہے۔

آمدنی کے حصول کے مذکورہ چاروں ذرائع اسلام میں معتبر اور جائز ہیں۔ فقہِ اسلامی کی کتابوں میں ان کے متعلق جامع اور مکمل ہدایات موجود ہیں۔

حکومت خواہ شخصی ہو، خواہ غیر شخصی، اس کی آمدنی عام لوگوں اور رعایا کی دسترس سے باہر ہوتی ہے، اس لیے اس مضمون میں اس امر پر کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے، ملازمت میں بھی آمدنی محدود ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں طے شدہ رقم ہی ملتی ہے، زائد نہیں ملتی، زراعت اور کاشت کاری میں اجر وثواب زیادہ ہے، کیوں کہ اس سے انسانوں کی ضرورتیں تو پوری ہوتی ہی ہیں، پرندوں، چوپایوں اور کیڑوں اور مکوڑوں کو بھی روزی ملتی ہے، پھر بھی زمین کی استعداد کے اعتبار سے پیداوار غیر محدود نہیں ہوتی، محدود ہوتی ہے، البتہ تجارت میں جتنی زیادہ محنت عمل میں لائی جاتی ہے اسی کے تناسب سے اللہ تعالیٰ اپنی مشیت اور مصلحت کے مطابق مال عطا فرماتا ہے۔ حدیثوں پر نظر رکھنے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کو زیادہ پسند فرمایا ہے، کیوں کہ تجارت کے ذریعہ جس وافر مقدار میں مال کا حصول ہوتا ہے کسی اور طریقہ سے اتنے وفور کے ساتھ وہ حاصل نہیں ہوتا ؛اس لیے اس مضمون میں صرف تجارت پر، وہ بھی اجتماعی تجارت پر گفتگو کی گئی ہے، بقیہ ذرائع سے تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

آمدنی کا ذریعہ خواہ کوئی بھی ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قید لگا دی ہے کہ حرام کسی حال میں نہ ہو، یعنی سود اور قمار کی آمیزش نہ ہو، یا اور کوئی ناجائز صورت نہ ہو، یعنی جس شئے کی خرید و فروخت اور لین دین کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے اس کا کاروبار اور لین دین نہ کیا جائے، مثلاً خنزیر اور شراب کو کسی حال میں آمدنی کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

تجارت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ آدمی اکیلے اپنا سرمایہ لگائے اور سارا نفع بھی اکیلے ہی لے، اس کو ہم تفہیم میں آسانی کے لیے انفرادی تجارت کہہ سکتے ہیں۔ عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہؓ میں اور بعد کے ادوار سے لے کر اب تک انسانوں کے ہر طبقہ میں انفرادی تجارت کا بھی طریقہ رائج رہا ہے اور ہے۔ انسانوں کی طویل تاریخ شاہد ہے کہ یہ طریقہ مفید و مقبول ہے، کسی بھی آسمانی یا غیر آسمانی مذہب نے اس پر پابندی نہیں لگائی ہے۔ تعامل و توارث فقہ اسلامی میں معتبر ہے، اس لیے انفرادی تجارت بلاشبہ جائز ہے۔

تجارت کی دوسری صورت یہ ہے کہ چند آدمی مل کر باہمی مشورہ سے کاروبار کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جامع الفاظ میں تجارت کی جو ترغیب دی ہے، اس میں انفرادی اور اجتماعی تجارت کی دونوں شکلیں شامل ہیں؛ لیکن اسلام میں اجتماعیت کی جو اہمیت ہے، اس کے پیش نظر بھی اور حدیثِ ذیل سے بھی اجتماعی تجارت کی فضیلت زیادہ ثابت ہوتی ہے۔ سنن ابو داؤد میں حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

" أَنَا ثَالِثُ الشَّرِيكَيْنِ مَا لَمْ يَخُنْ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهِ ، فَإِذَا خَانَ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنِهِمَا ."(۲/۴۸۰) و زاد رزين " وَ جَاءَ الشَّيْطَانُ "(۱)

"دو شرکاء میں سے کوئی ایک جب تک دوسرے سے خیانت نہ کرے، میں ان کے ساتھ رہتا ہوں، جب کوئی خیانت کرتا ہے تو میں ان سے الگ ہو جاتا ہوں اور وہاں شیطان آجاتا ہے۔"

فقہائے کرام نے کاروبار میں شرکت کی اوّلاً تین قسمیں لکھی ہیں، شرکت بالاموال، شرکت بالاعمال اور شرکت بالوجوہ، پھر ان تینوں قسموں میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں بتائی ہیں، ایک مفاوضہ، دوسری عنان۔ اگر شرکت ہر طرح من کل الوجوہ ہو، ذمہ داری اور نفع برابر ہو تو اس کو مفاوضہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اگر کم زیادہ ہو تو اس کو شرکت عنان کہتے ہیں۔ اس طرح شرکت کی چھ قسمیں بن جاتی ہیں۔ شرکت کی یہ تمام قسمیں اسلام میں جائز ہیں۔

علامہ شامیؒ نے ابن ہمامؒ کے حوالہ سے مطلق شرکت کے تعلق سے ایک جگہ بجا لکھا ہے:

" لاشك أن مشروعيتها أظهر ثبوتا إذا التوارث و التعامل لها من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم و هلم جراً متصل لايحتاج فيه لاثبات حديث بعينه . " (۲)

"بلاشبہ شرکت کی مشروعیت بالکل ثابت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر اب تک مسلسل اس پر لوگوں کا تعامل ہے؛ اس لیے اس کے جواز کے ثبوت کے لیے کسی متعین حدیث کی احتیاج نہیں۔"

ذیل میں ہم فقہائے کرام کی تقسیم اور اصطلاحات سے قطع نظر کرتے ہوئے شرکت کی چند جائز شکلیں لکھتے ہیں، تاکہ اپنے اپنے حالات اور مواقع کے اعتبار سے عام مسلمان اختیار کر سکیں۔ یہ لکھنا مفید رہے گا کہ مسلمان اگر اجتماعی تجارت کو اختیار کر لیں تو معاشیات کی اصلاح و استحکام میں بڑی حد تک اور نمایاں مدد ملے گی۔

(۱) جمع الفوائد ۱/۳۵۵ (۲) فتاویٰ شامی ۶/۴۶۵، ط دیوبند

(۱) ایک صورت یہ ہے کہ ایک فریق کا سرمایہ ہو اور دوسرا فریق اس سرمایہ سے کاروبار کرے اور باہم معاہدہ کے ذریعہ کاروبار کی نوعیت، طریقہ کار، اور نفع و نقصان میں تناسب کے لحاظ سے شرکت طے کرلیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے مال لے کر اسی طرح کی تجارت کی تھی۔(۱) اس کو فقہ کی اصطلاح میں مضاربت کہتے ہیں۔ مضاربت کو عام فقہائے احناف شرکت نہیں کہتے، بلکہ شرکت سے الگ معاملہ قرار دیتے ہیں، اگرچہ کچھ لوگ اسے شرکت ہی کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ عوام اسے شرکت سمجھتے ہیں، اس لیے اسے شرکت کے ذیل میں بیان کرنا درست ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ دو یا اس سے زیادہ افراد باہمی مشورہ سے برابر یا کم زیادہ سرمایہ لگائیں اور باہمی معاہدہ سے ذمہ داری اور نفع نقصان میں شرکت تناسب کے لحاظ سے طے کرلیں۔ شیرز کمپنی کا کاروبار اسی صورت میں داخل ہے۔ اگر کمپنی حلال چیزوں کا کاروبار جائز طریقہ سے کرے تو اس کا شیرز خریدنا جائز ہے۔(۲)

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی فریق اپنا سرمایہ نہ لگائے، بلکہ اپنے ہنر کی بنیاد پر کام کریں، مثلاً ٹیلرنگ کا کام جاننے والے ٹیلرنگ کا کام مشترکہ طور پر کریں اور باہم طے کرلیں کہ کتنے فیصد کس کو نفع ملے گا۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی فریق نہ تو سرمایہ لگائے اور نہ وہ کوئی ہنر جانتا ہو، لیکن مشترکہ طور سے کاروبار کرنا چاہتے ہوں تو اس کی شکل یہ ہے کہ وہ اپنے اعتماد اور اثر و رسوخ کو کام میں لاکر اصحابِ ثروت سے یا دوکانداروں سے ادھار مال لیں اور فروخت کریں، پھر باہم معاہدہ کرکے نفع و نقصان میں شرکت طے کرلیں۔

یہ ساری شکلیں اسلام میں جائز ہیں ؛ لیکن کسی صورت میں یہ جائز نہیں کہ کوئی فریق نفع کی کوئی متعین رقم وصول کرے، مثلاً کوئی فریق یہ کہے کہ مجھے ماہانہ بہر حال پچاس روپے ملنا چاہیے، تو یہ جائز نہیں ہوگا ؛ کیوں کہ فی صد کے لحاظ سے نفع و نقصان کا تعین ضروری ہے۔

(۵) پانچویں شکل یہ ہے کہ کسی کی مملوکہ زمین لے کر ایک شخص یا چند آدمی باہم معاہدہ کے بعد کاشت کریں اور باہمی معاہدہ کے مطابق اس کی پیداوار جو مالکِ زمین کو دینی ہو دے دیں، پھر جو بچے اس کو آپس میں باہم طے شدہ اصول کے مطابق تقسیم کرلیں۔ اس پانچویں شکل میں بھی

(۱) سیرۃ المصطفیٰ: ۱/۱۰۰ (۲) ملاحظہ ہو تجاویز سمینار ۱۹۹۶ء اسلامی فقہ اکیڈمی، نئی دہلی

مزارعین میں سے کسی کے لیے یہ درست نہ ہوگا کہ وہ کوئی خاص مقدار اپنے لیے طے کرلے، بلکہ یہ ضروری ہوگا کہ پیداوار کو تناسب کے لحاظ سے آپس میں تقسیم کریں۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ معاملات کو لکھ لینا اسلام میں پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب قرض کا لین دین کیا جائے تو اسے تحریر کرلیا جائے۔ (بقرۃ: ۲۸۲) قرض کا لین دین بھی دوسرے معاملات کی طرح ایک معاملہ ہے، اس لیے اس حکم میں دوسرے معاملات بھی شامل ہیں۔ دو آدمیوں کے درمیان جو معاملہ ہو اگر اس کو لکھ لیا جاتا ہے تو نزاع کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ مشترکہ کاروبار میں فریقین کے درمیان کسی وقت بھی نزاع کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لیے جب مشترکہ کاروبار کیا جائے تو معاہدہ کو تفصیل سے لکھ لینا ہی مناسب ہوگا۔ ذیل میں معاہدہ کا ایک نمونہ دیا جارہا ہے، اس کو سامنے رکھ کر فریقین حسبِ حالات اپنا معاہدہ تیار کرسکتے ہیں۔

> "یہ دستاویز فلاں فلاں کے درمیان کاروبار میں شرکت کا معاہدہ نامہ ہے،
> اس شرکت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے خوف اور دیانت داری پر ہے، اس میں اس قدر سرمایہ فلاں کا اور اس قدر سرمایہ فلاں کا ہے، اس کاروبار میں دونوں کا حق ہوگا اور فلاں کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ اور فلاں کی یہ ذمہ داری ہوگی، جو کچھ نفع نقصان ہوگا اس میں اتنے اتنے فی صد کے حساب سے فریقین شریک ہوں گے۔"(۱)

اس طرح کا مضمون لکھ کر ہر فریق اپنا اپنا دستخط مع تاریخ ثبت کردے گا اور اگر کاروبار میں سرمایہ نہ لگایا جارہا ہو، بلکہ ہنر کی بنیاد پر شرکت کی جارہی ہو، یا ہنر بھی نہ ہو، بلکہ اثر ورسوخ سے کاروبار کیا جارہا ہو، تو مضمون میں اس کی وضاحت ضروری ہوگی۔

خدا کرے کہ یہ مختصر مضمون ملت کے بے روزگار بھائیوں کے لیے ترغیب کا ذریعہ ثابت ہو اور اسلام کی دی ہوئی رعایتوں اور ہدایتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے معاش کی اصلاح واستحکام کی طرف متوجہ ہوں۔

☆☆☆

(۱) کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ باب الشرکۃ

انسدادِ منشیات اور تعلیماتِ نبویؐ

مفتی اشرف علی قاسمی

اسلام واحد مذہب ہے جو انسانی شعبۂ حیات کے تمام گوشوں کے بارے میں واضح ہدایات دیتا ہے اور ان چیزوں کے بارے میں بھی بلا استثناء رہنمائی کرتا ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح انسانی زندگی سے ہو، ایک طرف عقیدہ و عبادت، اخلاق و معاملات اور جنگ و صلح سے متعلق احکام موجود ہیں تو دوسری طرف انسان کے خورد و نوش اور لباس و پوشاک سے متعلق واضح احکام بھی ہمیں ملتے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف روحانی طبیب تھے کہ بہت سے روحانیت اور ہدایت سے محروم لوگوں کا آپؐ نے روحانی علاج کیا اور ان کی روحانی تسکین کا سامان فرمایا، تو دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ جسمانی طبیب بھی تھے کہ بہت سی چیزیں جو انسانی صحت کے لیے مضر اور نقصان دہ تھیں، آپؐ نے ان کو حرام قرار دیا اور آج سے پندرہ صدی قبل ہی اس کی وضاحت فرمادی۔

شراب اور نشہ آور اشیاء کا استعمال صرف بیسویں صدی کا مرض نہیں، بلکہ قدیم اطباء کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے چار ہزار سال قبل ہی افیون کی پیداوار جنوبی ایشیاء کے وسطی علاقہ میں ہوا کرتی تھی (۱) اور کتبِ سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے شراب کا استعمال عام تھا اور اکثر قومیں اس میں مبتلا تھیں، عربوں کا حال یہ تھا کہ شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی، شراب پینا پلانا اچھے گھرانوں میں لطف اور تفریح کا سامان تھا، ہر چھوٹے اپنے بڑے کو شراب پیش کرتے تھے، شراب اور نشہ جن برائیوں اور مفاسد کی جڑ ہے، ان کا بھی ظہور ہوتا رہتا تھا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے بڑے دلنشیں انداز میں اس کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے۔

(۱) دیکھئے فقہ الاشربۃ وحدہا/ ۳۵۵

جو اُن کی دن رات کی دلگی تھی　　شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی　　غرض ہر طرح ان کی حالت بری تھی

بہت اس طرح ان کی گزری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھی بدیاں

اسلام سے پہلے جتنے مذاہب تھے، اُن میں بھی شراب کی کچھ کچھ برائی بیان کی گئی تھی، لیکن قطعی حرمت کسی بھی مذہب میں بیان نہیں کی گئی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور اسلام آیا تو اس نے بھی بہ یک دفعہ حرام قرار نہیں دیا اور نہ ہی ایسا کرنا ممکن تھا، کہ عرب اس کے حد درجہ خوگر تھے، اس لیے پہلے فرمایا گیا:

"وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ." (نحل/۹)

"تم کو کھجور اور انگور کے میوے دیئے گئے، تم ان سے نشہ بناتے ہو اور اچھی روزی بھی، اس میں ان لوگوں کے لیے خدا کی نشانی ہے جو سمجھتے ہیں۔"

اس میں اشارہ ہے کہ نشہ اچھی چیز نہیں، اللہ نے تم کو کھجور اور انگور کی نعمت دی، لیکن تم اس سے نشہ جیسی نقصاندہ چیز بناتے ہو اور پیتے ہو۔ اس کے بعد بتایا گیا کہ اس میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ ارشاد باری ہوا:

"قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ." (بقرۃ: ۲۱۹)

"آپ کہہ دیجئے ان دونوں (کھجور اور انگور کی شراب) میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں لوگوں کے لیے۔"

کچھ صحابہؓ نے تو اتنی ہی ہدایت پر شراب سے توبہ کرلی، لیکن عام طور پر صحابہؓ کا خیال یہی تھا کہ شراب مکمل طور پر حرام نہیں ہوئی ہے، اس لیے اس سے عمومی طور پر اجتناب اور پرہیز نہیں برتا جاتا تھا۔

ایک دفعہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے بعض صحابہؓ کی دعوت کر رکھی تھی، جس میں مے نوشی کا بھی انتظام تھا، جب یہ سب حضرات کھاپی چکے تو مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا اور حضرت علیؓ کو امام بنا دیا گیا، انہوں نے قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کی تلاوت شروع کی، تلاوت میں نشہ کی وجہ سے سخت غلطی ہوئی، تو آیت نازل ہوئی کہ نشہ کی حالت میں نماز ادا نہ کی جائے:

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ" (نساء: ۴۳)

”اے ایمان والو! تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو۔“

مسلمانوں کو اس ہدایت سے معلوم ہو گیا کہ شراب ایسی خراب چیز ہے جو انسان کے لیے نماز جیسی عبادت سے رکاوٹ بنتی ہے۔ بہت سے حضرات نے اسی وقت شراب چھوڑنے کا اہتمام کر لیا اور دوسرے لوگ بھی اس کی خرابی کو محسوس کرنے لگے، نماز کے وقت شراب سے احتیاط کرتے اور دوسرے اوقات پی لیا کرتے؛ تاہم صحابہؓ اس سلسلہ میں مضطرب تھے اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کو کچھ زیادہ ہی اضطراب تھا، اس لیے دعا کرتے تھے: ”خداوند! شراب کے بارے میں واضح حکم نازل فرمادیجئے! اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِي الْخَمرِ بَیَانًا شَافِیًا (۱) چنانچہ تیسرے مرحلہ میں شراب کی قطعی حرمت کا صریح حکم نازل ہو گیا:

”یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَ الْبَغْضَاءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَ عَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ۔“ (مائدہ: ۹۰)

”اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب، جوا اور بت اور قرعہ کے تیر، یہ سب گندی باتیں اور شیطانی کام ہیں، اس لیے ان سے بچتے رہو۔ شاید تمہارا بھلا ہو، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں شراب اور جوئے سے دشمنی اور بغض ڈال دے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، پھر اب تم باز آؤ گے۔؟

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلا کر کہا: خداوند! ہم باز آگئے (۲)، چنانچہ اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ شراب کے مٹکے الٹے جارہے تھے اور شراب زمین پر نالوں کی طرح بہائی جارہی تھیں (۳)

شراب کی حرمت کے اسباب کی بھی قرآنِ کریم نے وضاحت سے کی ہے کہ اوّل تو یہ شیطانی کام ہے، دوسرے اس کو پی کر لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور وہ کام کر گذرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہیں کرتے، اس کی بدولت کتنے لوگ خود کشی کرتے ہیں، کتنے ہی لوگ قتل کیے جاتے ہیں، تیسرے شراب کی مستی انسان کو خدا کی یاد اور نماز سے غافل کر دیتی ہے، علاوہ ازیں خود اپنے دنیوی مفید کاموں اور مصالح سے بھی ایسا حال ہو جاتا ہے کہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام و نامراد ہو جاتی ہے۔

(۱) مجمع الزوائد ۵/۱۵ (۲) ابوداؤد: باب تحریم الخمر (۳) صحیح بخاری: کتاب الاشربۃ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کی قباحت وشناعت اور حرمت کے سلسلہ میں کئی احادیث مروی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کوئی مومن شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان رخصت ہو جاتا ہے،(۱) آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا(۲)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : جس نے شراب پی، چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی اور جس نے چوتھی بار شراب پی، اس کو آخرت میں جہنم کی نہر سے پلایا جائے گا،(۳) یہ بھی فرمایا کہ جس نے دنیا میں شراب پی اور پیتا رہا ہے وہ آخرت کی شراب سے محروم رہے گا(۴)، ایک روایت میں فرمایا گیا : ''اَلْخَمْرُ اُمُّ الْفَوَاحِشِ وَ اَکْبَرُ الْکَبَائِرِ''، ''شراب تمام برائیوں کی جڑ اور بڑے گناہوں میں سے بڑا گناہ ہے۔(۵)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج کے لیے تشریف لے گئے تو آپؐ کے سامنے دو پیالے رکھے گئے، ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب۔ آپؐ نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا : اس خدا کی حمد جس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی، اگر شراب کا پیالہ اٹھالیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔(۶) گویا شراب اس دنیا میں گمرہی کی پیش خیمہ ہے۔ آپؐ صرف شراب ہی کو حرام قرار نہیں دیا، بلکہ اس کے لوازم اور متعلقات کو بھی حرام قرار دیا۔

آپ کی انہی تعلیمات کا اثر تھا کہ جو لوگ شراب کے دیوانے اور عاشق تھے، انہوں نے اس طرح شراب چھوڑی کہ پھر کبھی منھ کو نہیں لگائی اور انہوں نے اس کی طرف نظر نہیں دوڑائی۔

ہر نشہ آور چیز حرام ہے

شراب کے لیے قرآن میں خمر کا لفظ استعمال ہوا ہے اور خمر کہتے ہی ہیں اس چیز کو جو عقل پر چھا جائے۔ جن چیزوں کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش سے محروم کردے وہ خمر کی حقیقت میں داخل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : کُلُّ مُسْکِرٍ خَمْرٌ وَکُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور شئ حرام ہے۔(۷)

ابو داؤد شریف کی حدیث میں شراب کی حقیقت میں مزید عموم کا اشارہ ملتا ہے۔ حضرت عمرؓ سے مروی ہے :

''اَلْخَمْرُ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ .''، ''جو شئ عقل کو مخمور کردے وہ خمر ہے۔''(۸)

(۱) صحیح بخاری : کتاب الاشربۃ (۲) صحیح بخاری کتاب الاشربۃ (۳) ترمذی عن ابی عمرؓ باب ماجاء فی شارب الخمر (۴) حوالہ سابق (۵) مجمع الزوائد : باب ماجاء فی الخمر و من یشربہا ۵/ ۶۷ (۶) صحیح بخاری کتاب الاشربۃ (۷) مسلم عن ابن عمران، باب بیان ان کل مسکر خمر وان کل خمر حرام (۸) ابو داؤد عن عمر، باب تحریم الخمر

اسی لیے جمہور فقہاء کے نزدیک خمر کے حکم میں ہر نشہ آور چیز شامل ہے اور احناف میں امام محمدؒ کی رائے بھی یہی ہے۔(۱) اور احناف کے نزدیک بھی مفتی بہ مذہب یہی ہے کہ ہر نشہ آور شیَ حرام ہے۔(۲)

حدیث کی صراحتوں اور جمہور فقہاء کی آراء سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز نشہ آور ہو، وہ حرام ہے۔ فی زمانہ بہت ساری چیزیں ایسی بھی ہیں جو جامد اور غیر سیال ہیں۔ یہ دو طرح کی ہیں :

(۱) مخدرات یعنی وہ چیزیں جو اعضاءِ انسانی کو بے حس کر دیتی ہیں۔ عبدالوہاب عبدالسلام طویلہ مخدرات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" و يطلق الفقهاء لفظ المخدرات على المسكرات غير المائعة كالحشيشة و الافيون ."(۳)

"فقہاء مخدرات کا اطلاق غیر سیال نشہ آور اشیاء پر کرتے ہیں جیسے حشیش اور افیون۔"

مخدرات کے استعمال سے بدن میں سستی، کاہلی اور ایک قسم کا ضعف محسوس ہوتا ہے، جب کہ شراب جیسی مسکر اشیاء سے جسم میں وقتی چستی توانائی آتی ہے۔

ہیثمیؒ نے دونوں کا فرق ان الفاظ میں بیان کیا :

"انّ من شان الأسكار بالخمر أن يتولد عنه النشاط و الطرف و العربدة و الحمية و من شأن السكر بنحو الحشيشية أن يتولد عنه أضداد ذلك من تحذير البدن و فتوره و من طول السكوت و النوم و عدم الحمية ."(۴)

"شراب سے پیدا ہونے والے نشہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے چستی، انبساط، بدخلقی اور تکبر وغیرہ پیدا ہوتا ہے اور عام مسکرات مثلاً حشیش وغیرہ سے اس کے برعکس اوصاف رونما ہوتے ہیں، جیسے جسم کی نقاہت، سستی، طویل خاموشی، غنودگی اور بزدلی۔"

پس یہ جامد اشیاء بھی ناجائز ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نشہ لانے والی اور جسم میں سستی و کاہلی لانے والی اشیاء کے استعمال سے منع فرمایا۔ ابوداؤد شریف میں ہے :

"نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كُلِّ مُسْكِرٍ وَ مُفْتِرٍ ."(۵)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشہ پیدا کرنے والی اور اعضاء میں سستی کرنے والی چیزوں سے منع فرمایا ہے۔"

(۱) شامی ۵/ ۲۹۲ (۲) درِّ مختار : ۵/ ۲۹۲ (۳) فقہ الاشربۃ وحدہا/ ۳۴۱ (۴) الزواجر للہیثمی ۱/ ۲۱۴، ط البابی الحلبی (۵) ابوداؤد عن ام سلمہ، باب ماجاء فی السکر

اور علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں :

"و يحرم اكل البنج و الحشيشة و الأفيون ، لأنه مفسد للعقل و يسد عن ذكر الله و عن الصلوٰة ."(۱)

"بھنگ ، حشیش اور افیون کا کھانا حرام ہے، کیوں کہ یہ چیزیں عقل کو فاسد اور اللہ کے ذکر اور نماز سے غافل کر دیتی ہیں۔"

یہاں تک کہ بعض علماء نے ان کے حلال کہنے والے پر زندیق ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ نجم الدین زاہدی کہتے ہیں کہ : ایسا شخص کافر اور مباح القتل ہے۔(۲)

فی زمانہ چرس، بھنگ، افیون، گانجہ اور ہیروئین : یہ سب جامد نشلی اشیاء ہیں، ان سب کا استعمال حدیث نبویؐ کی وجہ سے حرام ہے ؛ البتہ بھنگ افیون وغیرہ سے نشہ آجائے تو اس پر شراب والی سزا جاری نہیں ہوگی، بلکہ اس سے کم درجہ کی سزا دی جائے گی، جس کو فقہاء تعزیر کہتے ہیں، فإن اكل شيئا من ذلك لا حدّ عليه و إن سكر منه بل يعزر بما دون الحد .(۳)

تمباکو، زردہ، گٹکا، سگریٹ

تمباکو، زردہ، گٹکا، سگریٹ : یہ سب گو افیون اور ہیروئین وغیرہ کی طرح زیادہ نشہ آور نہیں ہیں، تاہم کچھ نہ کچھ نشہ اس میں ضرور شامل رہتا ہے، اس لیے ان کا استعمال مکروہ ہے ؛ گو کہ بعض علماء نے اس کی حرمت اور بعض نے اباحت کا فتویٰ بھی دیا ہے۔(۴)

طبی نقطۂ نظر سے موجودہ دور میں تمباکو، زردہ، گٹکا، سگریٹ : صحتِ انسانی کے لیے سمِ قاتل ہیں اور شراب کی حرمت کی جو وجہ قرآن نے بیان کی کہ : "فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ" (بقرہ : ۲۱۹/) ان چیزوں پر بھی وہ علت منطبق ہوتی ہے۔ ان کے نقصانات کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ تمباکو اور اس سے بننے والی چیزوں کے نقصانات اور خطرات پر ریسرچ اور تحقیق کرنے کے لیے برطانیہ میں ۱۹۵۷ء میں ایک طبی بورڈ مقرر کیا گیا، انہوں نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اکثر اموات کی وجہ پھیپھڑوں کا سرطان ہے، جو تمباکو کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے اور ۱۹۶۲ء کی رپورٹ میں لکھا کہ ایک سال میں ۳۲/ہزار انسانوں کی موت صرف پھیپھڑوں کے سرطان کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ تو تین دہے پہلے کی رپورٹ ہے جب کہ ان مضر اور نشہ آور چیزوں کا استعمال آج کی طرح عام نہیں تھا، آج تو صورتِ حال بہت ہی دھماکو ہے، جو سنجیدہ اصحابِ فکر کو غور و فکر پر مجبور کر دیتی ہے۔

(۱) درمختار علی ہامش الرد ۵/ ۲۹۴ (۲) حوالہ سابق (۳) درمختار ۵/ ۲۹۵ (۴) حلال و حرام : ۱۷۱/

ہندوستان، پاکستان، امریکہ، یوروپ اور ان جیسے ممالک میں جہاں نشلی چیزیں بہ کثرت استعمال ہوتی ہیں، پیکٹ پر لکھا ہوتا ہے کہ "سگریٹ نوشی آپ کی صحت کے لیے مضر ہے"۔ آج ہر سال دنیا ۲۶/ جون کو انسدادِ منشیات کا دن مناتی ہے، لیکن منشیات کا استعمال اسی قدر دن بہ دن بڑھتا جارہا ہے۔ قرآن اور طبیبِ روحانی و جسمانی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو جن جن نشہ آور چیزوں کے نقصان دہ ہونے کی خبر دی تھی اور اجتناب کا حکم دیا تھا، آج دنیا اسی کو عظیم سائنسی تحقیق کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ باوجودِ قانونی انتباہ اور قانون سازی کے نشہ آور چیزوں کا استعمال بڑھتا ہی جارہا ہے۔ یہ بڑی خطرناک صورتِ حال اور انسانی سماج کے لیے رستا ہوا ناسور ہے۔ یہ صورتِ حال دراصل اس سزا اور تعزیر کو چھوڑ دینے کی بنیاد پر ہے جو اسلام نے مقرر کی تھی اور خوفِ آخرت کی کمی کے باعث ہے ؛ ورنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر اس کے انسداد کی صورت اختیار کی جائے تو وہ دن دور نہیں رہے گا جب کہ دنیا سے منشیات کا نام ونشان ہی اٹھ جائے گا۔

وَ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

☆☆☆

خودکشی — اسباب و علاج حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں

مولانا سید اسرار الحق سبیلی

دنیا کی ساری رنگا رنگی انسانی ذات سے قائم ہے، دنیا کی ساری چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفع کے لیے پیدا کی ہیں، ایک انسان کی جان اس قدر قیمتی ہے کہ ناحق ایک انسان کو ہلاک کرنا پوری انسانیت کو ہلاک کر دینے کے مترادف قرار دیا گیا ہے، مقاصدِ شریعت میں سے ایک اہم مقصد جان کی حفاظت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اولاد کی کثرت کی ترغیب دی اور فرمایا کہ میں امت کی کثرت پر فخر کروں گا(۱) اللہ کے رسولؐ نے سب سے پہلے مال کو اپنی ذات پر خرچ کرنے کا حکم فرمایا اور اپنی ذات پر خرچ کرنے میں بھی صدقہ کا ثواب قرار دیا،(۲) نیز آپؐ نے علاج کرانے کی ترغیب دی، تاکہ انسانی جان کی بقا کا سامان ہو اور انسان ہلاکت سے محفوظ رہے۔

جان ایک عظیم نعمت

دنیا کی ساری چیزیں اللہ کی عطا کردہ نعمت ہیں۔ ان میں سب سے عظیم نعمت زندگی ہے۔ زندگی کی بدولت ہی انسان دوسری نعمتوں سے فیض یاب ہونے کے لائق رہتا ہے اور انسان اس عظیم نعمت کو خیر کے کام میں لگا کر دنیا و آخرت میں بلند مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے پوچھا:

یا رسول اللہ ! أی الناس خیر ؟ قال : من طال عمرہ و حسن عملہ .(۳)

”اے اللہ کے رسول! کون آدمی بہتر ہے؟ فرمایا: جس کی عمر لمبی ہو اور اس کا عمل اچھا ہو۔“

(۱) نسائی: ۲/۷۰ (۲) مسلم: ۱/۳۲۲ (۳) رواہ احمد والدارمی، مشکوٰۃ: ۲/۴۵۱

ایک ہفتہ کی زندگی میں انسان کس قدر نیکیاں کرلیتا ہے، اسکا اندازہ مذکورہ حدیث سے ہوتا ہے:

" عن عبید بن خالد أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم آخی بین رجلین ، فقتل أحدهما فی سبیل اللّٰه ، ثم مات الآخر بعده بجمعة أو نحوها فصلوها علیه ، فقال النبی صلی الله علیه وسلم : ما قلتم ؟ قالوا : دعونا اللّٰه أن یغفر له و یرحمه و یلحقه بصاحبه ، فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم : فأین صلاته بعد صلاته و عمله بعد عمله، أو قال : صیامه بعد صیامه لما بینهما أبعد مما بین السماء و الأرض . " (۱)

"سیدنا عبید بن خالدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کو برادرانہ رشتہ سے جوڑا، ایک اللہ کے راستہ میں شہید ہوگیا، تقریباً ایک جمعہ کے بعد دوسرے کا بھی انتقال ہو، لوگوں نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی، نبیؐ نے پوچھا: تم نے اس کے لیے کیا دعا کی؟ لوگوں نے کہا ہم نے اللہ سے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادیں، اس پر رحم کریں، اس کو اس کے ساتھی کا درجہ عنایت کریں نبیؐ نے فرمایا: جو نمازیں اس نے اس کے بعد ادا کیا اور جو نیک عمل اس کے بعد کیے، انکا کیا ہوا؟ یا روزوں کا بھی ذکر کرتے ہوئے فرمایا: زمین و آسمان سے زیادہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں بھی زیادہ عمر پانے والے کا درجہ شہید سے زیادہ بتایا گیا ہے: "سیدنا عبداللہ بن شدادؓ کہتے ہیں کہ بنو عذرہ کے تین آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، انہوں نے اسلام قبول کرلیا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری طرف سے کون ان کی ذمہ داری لے گا؟ حضرت طلحہؓ نے کہا: میں لوں گا، وہ لوگ ان کے پاس رہنے لگے، نبیؐ نے ایک لشکر روانہ فرمایا، ایک آدمی اس میں نکلا اور شہادت حاصل کی، پھر آپؐ نے ایک لشکر روانہ کیا، دوسرا جہاد میں نکلا، اس نے بھی شہادت پائی، بعد میں تیسرے آدمی نے بستر پر وفات پائی۔ طلحہؓ کہتے ہیں: میں نے ان تینوں کو جنت میں دیکھا، سب سے آگے بستر پر مرنے والا تھا، اس کے بعد آخر میں شہادت پانے والا، اس کے بعد پہلے شہادت پانے والا، مجھے بہت تعجب ہوا، میں نے نبی کریمؐ سے اس کا تذکرہ کیا، آپؐ نے فرمایا: اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شخص سے بڑھ کر کوئی افضل نہیں جو زیادہ اسلام کا زمانہ پائے، تسبیح، تہلیل اور تکبیر کا اسے زیادہ موقع حاصل ہو۔ (۲)

ایک مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" إن عبد الو خر علی وجهه من یوم ولد إلی أن یموت هرما فی طاعة اللّٰه ، لحقره فی ذلك الیوم ، و لود أنه رد إلی الدنیا کما یزداد من الأجر و الثواب . "

(۱) رواہ ابو داؤد و النسائی، مشکوٰۃ: ۲/۳۵۱ (۲) رواہ احمد، مشکوٰۃ: ۲/۳۵۲

"اگر بندہ پیدائش کے دن بڑھاپے کی موت تک اپنی پیشانی اللہ کی اطاعت میں جھکائے رہے ، پھر بھی وہ قیامت کے دن اسے حقیر ہی خیال کرے گا، اس کی خواہش ہو گی کہ وہ دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے، تاکہ مزید اجر و ثواب حاصل کرنے کا موقع ملے۔"

جان ایک امانت ہے

جان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ امانت ہے، انسان اپنی جان کا مالک نہیں ہے، جس طرح دوسرے کی جان ضائع کرنے کا کسی کو اختیار نہیں، اسی طرح اپنی جان ضائع کر دینے کا بھی اختیار نہیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلم کی شرح میں لکھا ہے:

" و يؤخذ منه أن جناية الإنسان على نفسه كجنايته على غيره في الإثم ، لأن نفسه ليست ملكا له ، بل هي لله ، فلا يتصرف فيها إلا بما أذن له فيها . " (۱)

"اپنی جان کو ضائع کرنے میں اتنا ہی گناہ ہے، جتنا دوسرے کے جان کو ضائع کرنے میں ہے، کسی کو اپنی جان میں ملکیت حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ کی ملکیت ہے، اس میں بغیر اجازت زیادتی کرنے کا حق نہیں۔

اپنی جان میں دوسروں کا حق

انسان اپنی ذات سے صرف خود ہی فائدہ نہیں اٹھاتا، اس کی ذات سے دوسروں کا حق اور دوسرے کا مفاد بھی وابستہ ہوتا ہے، آدمی کسی کا بیٹا، کسی کا باپ، کسی کا شوہر، کسی کا بھائی اور کسی کا چچا ہوتا ہے، ایک انسان کی ذات سے اپنے پرائے سب فائدہ اٹھاتے ہیں اور فائدے کی امید لگاتے ہیں۔ خودکشی سے نہ صرف ایک فرد کا نقصان ہوتا ہے، بلکہ ایک کنبہ ،ایک خاندان اور ایک سماج کا نقصان ہوتا ہے۔ اتنے لوگوں کو وحشت میں ڈالنا، ان کے حقوق ذائع کر دینا اور ان کی امیدوں پر پانی پھیر دینا ناقابل معافی جرم ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پرائے ہر ایک کے حقوق بتائے ہیں اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کی ترغیب دی۔ خودکشی سے چوں کہ یہ تمام حقوق ضائع ہو جاتے ہیں، اس لیے شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔

خودکشی کی ممانعت قرآن میں

قرآن مجید کی آیت سے صاف طور پر خودکشی کی ممانعت معلوم ہوتی ہے :

" وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا . " (النساء : ۲۹)

(۱) فتح الملہم :۱/ ۲۶۵

"تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہیں۔"

قرآن عظیم میں ایک جگہ ارشاد ہے:

" وَ أَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلى التَّهْلُكَةِ . " (البقرة : ۱۹۵)

"اللہ کے راستہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

حافظ ابن کثیر دمشقی (م : ۷۷۴ھ) نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے :

" إن رجالا كانوا يخرجون فی بعوث يبعثها رسول الله صلى الله عليه وسلم بغير نفقة ، فإما أن يقطع بهم ، و إما كانوا عيالا فأمرهم الله أن يستنفقوا مما رزقهم ، و لايلقوا بأيديهم إلى التهلكة . و التهلكة أن يهلك رجال من الجوع و العطش أو من المشى . " (۱)

"کچھ لوگ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے روانہ کردہ لشکروں میں بغیر اخراجات کے نکلتے، اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ یا تو وہ جانے سے رک جائیں یا خاندان والوں سے نفقہ حاصل کریں اور اپنے ہاتھوں ہلاکت کا سامان نہ کریں، ہلاکت یہ ہے کہ آدمی بھوک پیاس کی شدت اور چلنے کی مشقت سے ہلاک ہو جائے۔"

خودکشی سے اللہ کے رسول ﷺ کی ممانعت

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی جگہ خودکشی کرنے والے کا خطرناک انجام بتا کر اس برے فعل سے خبردار کرنے کی کوشش کی ہے؛ چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا :

" من قتل نفسه بحديدة عذب بها في نارِ جهنم . " (۲)

"جو شخص اپنے آپ کو دھاردار ہتھیار سے قتل کرے اسے جہنم کی آگ میں اسی سے عذاب دیا جائے گا۔"

دارمی کی روایت میں اس طرح کے الفاظ ہیں :

" من قتل نفسه بشيئ في الدنيا عذب به يوم القيامة . " (۳)

"جو دنیا میں جس چیز سے خودکشی کرے گا، قیامت کے دن اسی چیز سے اسے عذاب دیا جائے گا۔

مسلم کی روایت میں وضاحت کے ساتھ ارشاد ہے:

" من قتل نفسه بحديدة فحديدته في يده، يتوجأ بها فی بطنه في نار جهنم خالد

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۱۸ (۲) بخاری: ۱/ ۱۸۲ (۳) سنن الدارمی: ۲/ ۱۱۲

مخلدا فيها أبدا ، و من شرب سما فقتل نفسه فهو يتسحاه في نار جهنم خالد مخلدا فيها أبدا ، و من تردي من جبل و قتل نفسه فهو يتردي في نار جهنم خالد مخلدا فيها أبدا . "

"جو خود کو لوہے کے ذریعہ قتل کرے تو جہنم کی آگ میں وہ لوہا اس کے ہاتھ میں ہوگا، وہ اس کو ہمیشہ اپنے پیٹ میں چبھا رہا ہوگا، جس نے زہر پی کر خودکشی کی، وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ زہر گھونٹتا رہے گا، جس نے پہاڑ سے گر کر اپنی جان دے دی، وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں گرتا رہے گا۔" (۱)

اس سلسلے میں خود عہدِ نبوت کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ: سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خیبر میں حاضر ہوئے، اللہ کے رسولؐ نے ایک ایسے آدمی کے بارے میں جو اسلام کا دعویٰ کرتا تھا فرمایا: "یہ اہل جہنم میں سے ہے۔"، جب لڑائی کا وقت ہوا تو اس نے لڑائی میں نہایت دلیرانہ حصہ لیا، وہ کافی زخمی ہو گیا، زخم کی وجہ سے اس میں جنبش کی سکت بھی نہیں رہی، ایک صحابی رسول نے آکر کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے کہا تھا کہ وہ جہنمی ہے، اس نے اللہ کے راستہ میں جم کر مقابلہ کیا اور کافی زخمی ہو گیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ جہنمی ہی ہے، کچھ لوگوں کو تردد ہو رہا تھا، اس نے زخم میں بہت تکلیف محسوس کی، جھک کر ترکش سے ایک تیر نکالا اور اس سے اپنے آپ کو ذبح کر لیا، کچھ لوگ جلدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور اطلاع دی کہ اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے آپ کی بات سچ کر دی، فلاں شخص نے اپنے آپ کو ذبح کر لیا اور خودکشی کر لی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے بلال! کھڑے ہو کر اعلان کر دو کہ جنت میں مؤمن ہی داخل ہوگا، اللہ تعالیٰ فاجر شخص سے بھی اس دین کی مدد فرما دیتے ہیں۔" (۲)

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خودکشی کتنا سنگین جرم ہے، کہ جہاد جیسا مبارک عمل بھی خودکشی کرنے والے کو اس کی سزا سے نہیں بچا سکا۔

خودکشی کرنے والے کیساتھ اللہ کے رسول ﷺ کا سلوک

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی ہے؛ چنانچہ سیدنا جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں:

" إن رجلاً قتل نفسه ، فلم يصل عليه النبي صلى الله عليه وسلم . " (۳)

"ایک آدمی نے خودکشی کر لی تھی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔"

نسائی کی روایت میں اس طرح ہے:

(۱) مسلم :۱/۷۲ (۲) بخاری :۲/۹۷۷ کتاب القدر، باب العمل بالخواتیم (۳) (ترمذی :۱/۲۰۵)

"إن رجلاً قتل نفسه بمشاقص ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : أما أنا فلا أصلي . (۱)

"آدمی نے چوڑے تیر سے خود کو قتل کر لیا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو اِس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھوں گا۔"

علامہ سندھیؒ اس کی وجہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال النووی : أخذ بظاهره من قال : لایصلی علی قاتل نفسه لعصیانه ، و هو مذهب الأوزاعی ، و أجاب الجمهور بأنه صلی الله علیه وسلم لم یصلی علیه بنفسه زجرا للناس عن مثل فعله و صلت علیه الصحابة ، هذا کما ترك صلی الله علیه وسلم فی أول الأمر الصلاة علی من علیه دین زجراً لهم عن التساهل فی الإستدانة و عن إهمال وفائها ، و أمر أصحابه بالصلاة علیه ، فقال : صلوا علی صاحبکم . (۲)

"علامہ نوویؒ کہتے ہیں: اس حدیث کے ظاہر پر ان حضرات نے عمل کیا ہے، جو کہتے ہیں کہ نافرمانی کی وجہ سے خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی ، یہی امام اوزاعی کا مذہب ہے، جمہور علماء اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ایسے فعل سے لوگوں کو روکنے کے لیے آپؐ نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی، یہ ایسے ہے جیسے: آپؐ نے شروع میں مقروض شخص کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی ہے، اس کا مقصد لوگوں کو قرض کے معاملہ میں تساہل اور اس کی ادائیگی میں تاخیر سے روکنا تھا، البتہ آپؐ نے حضرات صحابہؓ کو نماز پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا: اپنے ساتھی کی نمازِ جنازہ پڑھو۔"

موجودہ زمانہ میں خودکشی

موجودہ دور میں خودکشی کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے، آج کل شاید ہی کسی دن کا اخبار خودکشی اور خودسوزی کے واقعات سے خالی رہتا ہے، چھوٹے بچوں کی خودکشی کے واقعات بھی پیش آرہے ہیں؛ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ ان بچوں نے ہمارے بڑوں اور پاس پڑوس کے ماحول سے یہ سیکھا ہے، ٹیلی ویژن میں خودکشی کی اداکاری نے ان کے دلوں سے اس سنگین حرکت کی قباحت نکال دی ہے۔ مغربی ملکوں میں تو خودکشی کی ایک حد تک حوصلہ افزائی کی جارہی ہے، وہاں ایسے ادارے قائم ہیں، جہاں

(۱) سنن النسائی: ۱/ ۲۷۹ (۲) حاشیۃ السندھی علی النسائی: ۱/ ۲۷۹

خودکشی کے سامان مہیا رہتے ہیں اور کوئی آکر آسانی سے اپنی جان دے سکتا ہے۔ اس سے بڑی انسانیت سوز حرکت اور کیا ہو سکتی ہے؟

خودکشی کے اسباب اور اس کا علاج

خودکشی کے مختلف اسباب و محرکات ہیں: زیادہ تر ایسے لوگ معاشی تنگی اور قرض کے بوجھ سے بچنے کے لیے خودکشی کر لیتے ہیں، طلبہ امتحان میں ناکامی کی خبر سن کر خودکشی کا اقدام کر بیٹھتے ہیں، خواتین سسرال والوں کے نہ ختم ہونے والے مطالبات سے تنگ آکر خودسوزی اور خودکشی جیسے انتہائی اقدام کر گذرتی ہیں، ناکام عاشق خودکشی کو اپنا علاج تصور کرتے ہیں، بلکہ فلمی دنیا کی دین ہے کہ اس کو بعض لوگ عشق و محبت کا کمال تصور کرتے ہیں۔ ان تمام محرکات کے پیچھے اصل وجہ ناامیدی، مایوسی، پست حوصلگی، بدگمانی، دل برداشتگی، بے صبری اور ایمان کی کمزوری ہے۔

اس لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں سے روکا ہے۔ انسان کو ظاہری اسباب کی بجائے اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے، اس سے خیر کی امید رکھنی چاہیے، کوئی بات اپنی مرضی کے خلاف پیش آئے تو اس پر صبر کرنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ ممکن ہے کہ اسی میں ہمارے لیے خیر کا کوئی پہلو ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں پیش آنے والے سرد و گرم حالات سے پہلے ہی باخبر کر دیا کہ دنیا میں آنے کے بعد انسان کو مختلف حالات سے دوچار ہونا پڑے گا، سخت سے سخت حالات میں وہ عزم و حوصلہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے، صبر سے کام لے، صبر کا بدلہ اگر اس دنیا میں نہیں مل سکا، تو آخرت میں تو آرام و راحت کی صورت میں یقیناً ملے گا، اس کے برخلاف خودکشی کا عمل دنیا و آخرت دونوں میں بے چینی و اضطراب کا باعث بنے گا۔ غالباً اسی پس منظر میں شاعر نے یہ بات کہی ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے   مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے ہی اس بات سے خبردار فرما دیا کہ یہ دنیا جائے امتحان ہے نہ کہ جائے انعام، اس لیے یہیں مصیبتیں اور آزمائشیں آئیں گی؛ چنانچہ ان مصیبتوں اور ابتلاؤں پر صبر کی تلقین فرمائی:

" وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَ الْأَنْفُسِ وَ الثَّمَرَاتِ وَ بَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا : إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ، وَ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ." (البقرة)

"ہم ضرور تمہیں کچھ خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال اور آمدنیوں کے نقصانات میں مبتلا کر کے آزمائیں گے (ان حالات میں) صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنادو، جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے، ان پر اللہ کی طرف سے عنایات اور رحمت ہوگی اور یہی لوگ راہِ راست پر ہیں۔

ایک جگہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مصیبت پر صبر کی تلقین اس طرح فرمائی کہ اس سے گناہ دھلتے ہیں۔ اس طرح مصیبت پر صبر کر کے آخرت کی دائمی اور راحت بخش زندگی حاصل کی جاسکتی ہے:

" ما یزال البلاء بالمؤمن و المؤمنة فی نفسه و ولده و ماله حتی یلقی اللّٰه تعالیٰ و ما علیه خطیئة ." (۱)

"جو مؤمن مرد اور عورت ہمیشہ اپنی جان واولاد کی آزمائش میں مبتلا رہتے ہیں، وہ ایسی حالت میں اللہ سے ملیں گے کہ ان کے پاس کوئی گناہ باقی نہیں رہے گا۔"

تنگی اور پریشانی سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، تنگی کے بعد آسانی بھی آتی ہے۔

" فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً ." (الانشراح : ۵ - ۶)

"یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، تنگی کے ساتھ دوگنی فراخی ہے۔"

معاشی تنگی سے پریشان ہو کر جان کو ہلاکت میں ڈالنا بھی بے فائدہ ہے۔ معاشی تنگی دور کرنے کے لیے اللہ کی ذات موجود ہے۔

" وَ لا تَقْتُلُوْا اَوْلادَکُمْ مِنْ اِمْلاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِیَّاهُمْ . (الانعام : ۱۵۱)

"اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انکو بھی دیں گے۔"

خودکشی کی ایک وجہ مستقبل سے مایوسی اور ناامیدی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے:

" یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لاتَقْنَطُوْا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعاً ." (الزمر : ۵۳)

"اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہ معاف کر دیتے ہیں۔

ایک جگہ فرمایا :

(۱) ترمذی بحوالہ ریاض الصالحین : ۳۶

" فَلا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِيْنَ قَالَ وَ مَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ الا الضَّالُّوْنَ ." (۱)

"تم مایوس نہ ہو، اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔"

مایوسی کے بارے میں ایک جگہ ارشاد ہے:

لاتَيْئَسُوْا مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لا يَايْئَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ اِلا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ ."

"اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ کی رحمت سے تو بس کافر لوگ ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔"

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مایوسی سے اس طرح روکا ہے:

"اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم اتنا گناہ کرو کہ تمہارے گناہوں سے زمین و آسمان کے درمیان کا حصہ بھر جائے پھر تم اللہ تعالیٰ سے معافی چاہو تو تمہاری مغفرت کردی جائے۔" (۲)

کاش! لوگ خودکشی کی سنگینی کو محسوس کریں، اپنی جان کی قدر و قیمت کا اندازہ کریں اور اپنی جان سے اپنے، پرائے اور ملک و قوم کو فائدہ پہنچانے کا ہمیشہ حوصلہ رکھیں!!

☆☆☆

(۱) الحجر: ۵۵-۵۶ (۱) مسند احمد بحوالہ ابن کثیر: ۴/ ۶۱

طلوعِ مہر رسالت

تاج الدین اشعؔر رام نگری

اُٹھو عظیم بشارت کی صبح آتی ہے
طلوعِ مہرِ رسالت کی صبح آتی ہے
محمدِ عربیؐ کا ظہور ہوتا ہے
خوشا کہ جشنِ ولادت کی صبح آتی ہے
گھٹائیں اٹھتی ہیں گھنگھور کوہِ فاراں سے
زمیں پہ بارشِ رحمت کی صبح آتی ہے
ازل سے گردِ دوراں تھی منتظر جس کی
اس عہد خیر و سعادت کی صبح آتی ہے

اُٹھو کہ رحمتِ حق آج جوش پر آئی
ضمیر کون و مکاں کی امید بر آئی

زمین اپنے مقدر پہ ناز کرتی ہے
کہ اس پہ صاحبِ لولاک آنیوالے ہیں
ہے ارضِ وادیِ مکہ پہ آج بارشِ نور
تمام دشت و جبل جگمگانے والے ہیں
یہ کائنات سجائی گئی تھی جن کے لیے
وہ بزم دہر میں تشریف لانے والے ہیں
وہ آمنہ کے پسر وہ یتیم عبد اللہ
جہاں کی قسمتِ خفتہ جگانے والے ہیں

دوبالا ان سے ہوگئی بزمِ حیات کی رونق
قدم سے ان کے بڑھی کائنات کی رونق

جدھر اُجالوں کے لشکر قدم بڑھاتے ہیں
فضا سے سارے اندھیرے سمٹتے جاتے ہیں
فضا میں گونج رہی ہے درود کی ملہار
طیور حمد و ثنا کے ترانے گاتے ہیں
دمک اُٹھی جبیں آج بیت کعبہ کی
تمام صحن و در و بام مسکراتے ہیں
چہل پہل ہے بہت آمنہ کے آنگن میں
فلک سے حور و ملائک اُترتے آتے ہیں

جہانِ کفر و ضلالت پہ اب زوال آیا
کہ ماں کی گود میں آج آمنہ کا لال آیا

رسولِ پاکؐ، وہ انسانیت کا رکھوالا
وہ بڑھ کے گرتے ہوؤں کو سنبھالنے والا
دلوں کو بخشنے والا سکوں کا سرمایہ
جنوں کو ہوش کے سانچے میں ڈھالنے والا

بہ سعی و جہدِ مسلسل خدا کے بندوں کو تباہیوں کے بھنور سے نکالنے والا
غریبوں، بیکسوں، بیواؤں اور یتیموں کو کنارِ رحمت و شفقت میں پالنے والا

جو پست تھے انہیں بالا کیا پیمبرؐ نے
جہاں میں حق کا اُجالا کیا پیمبرؐ نے

وہ فخر و نازشِ خلقت محمدؐ عربی وہ رازدارِ مشیت محمدؐ عربی
تمام عالمِ امکاں کے حق میں تا بہ ابد خدائے پاک کی رحمت محمدؐ عربی
نہ کوئی ان کا مقابل، نہ کوئی ان کا مثیل وہ صدر بزم رسالت، محمدؐ عربی
وجود جس کا سراپا جمال و یکتائی دل و نگاہ کی جنت محمدؐ عربی

ہر ایک نبی کو تو بس رہنما بنایا تھا
خدا نے ان کو مگر مصطفٰے بنایا تھا

ہزاروں لاکھوں میں تنہا دکھائی دیتا ہے وہ اپنی ذات میں یکتا دکھائی دیتا ہے
خدا تو ہو نہیں سکتا، مگر بہ شکلِ بشر خدا کا نور سراپا دکھائی دیتا ہے
خدا کے بعد اُسی ذات پاک کا جلوہ ثریٰ سے تا بہ ثریا دکھائی دیتا ہے
خدا نے مکہ کی کھائی قسم نبیؐ کے سبب مدینہ ان سے مدینہ دکھائی دیتا ہے

مٹھاس نام محمدؐ میں ہے عجب اب بھی
کہ نام لو تو چپک جائیں لب سے لب اب بھی

وہ سنگ باریٔ طائف سے دلفگار بھی ہے تو دشمنوں کیلئے اسکے دل میں پیار بھی ہے
کھلے ہیں جسم پہ صدہا گلاب زخموں کے مگر وہ صبر و عزیمت کا کوہسار بھی ہے
کھلا کے اوروں کو خالی شکم جو سوجائے اسی کا سارے خزانوں پہ اختیار بھی ہے
اسی کے خون کے پیاسے بھی اہل مکہ میں امانتوں کے لیے اس پہ اعتبار بھی ہے

وہ سب کو مہر و وفا کے اصول دیتا ہے
وہ کانٹے پھینکنے والوں کو پھول دیتا ہے

جہانِ کہنہ میں برپا وہ انقلاب کیا کہ کفر و شرک کو وہم و خیال و خواب کیا
اٹھا کہ فرشِ زمیں کے حقیر ذرّوں کو حریفِ مہر کیا، رشکِ آفتاب کیا
نہ ملک و قوم، نہ رنگ و نسب باعثِ فخر فضیلتوں کا مرتب نیا نصاب کیا

عجیب شان تھی اس کی کہ خود تو امّی تھا　　　مگر خدا نے اسے صاحبِ کتاب کیا

جہاں میں علم کے دریا بہا دیئے اس نے
جہالتوں کے نشان تک مٹا دیئے اس نے

وہ جس نے پنجۂ ظلم و ستم کو مروڑ دیا　　　ستم گروں کو نگوں سر کر کے چھوڑ دیا
وہ جس نے درسِ محبت دیا زمانے کو　　　وہ جس نے خاک کے ٹوٹے دلوں کو جوڑ دیا
وہ جس نے اپنے فقیروں کو تاجداری دی　　　وہ جس نے کج کلیوں کا غرور توڑ دیا
وہ جس نے فتنۂ و شر کے مٹا دیئے آثار　　　وہ جس نے سیلِ حوادث کے رُخ کو موڑ دیا

وہ جس نے کفر کی طاقت کا سر کچل ڈالا
وہ جس نے وقت کی رفتار کو بدل ڈالا

جدھر جدھر سے وہ خوباں کا تاجدار چلے　　　جلو میں قافلۂ فصل نو بہار چلے
خدا سے ملنے جو رفرف پہ وہ سوار چلے　　　تو شوقِ دید میں قدسی امیدوار چلے
خرامِ ناز پہ اس کے فدا نسیمِ سحر　　　چلے تو غنچے کھلاتا وہ صدر ہزار چلے
غبارِ راہ ہوں جب اس کے نجم و کہکشاں　　　نہ مہر و ماہ پہ کیوں اس کا اختیار چلے

ہے خواب جس کا حسیں آج بھی خیال حسیں
نہ جانے کیسا تھا وہ صاحبِ جمال حسیں

مری نماز میں وہ ہیں مری اذان میں وہ　　　مری نظر میں مرے دل میں مری جان میں وہ
خدا کو بندوں سے تھا کون جوڑنے والا　　　اگر نہ واسطہ بن جاتے درمیان میں وہ
ورق ورق میں ہے قرآں کے انکا ذکرِ جمیل　　　زبور و وید و اناجیل کے بیان میں وہ
ہیں میتریہ ، نراشنس اور فارقلیط　　　ہر ایک دور میں وہ ہیں، ہر ایک زبان میں وہ

کہا ہے ویدوں نے آئے ہیں بے شمار رشی
بالآخر آئے گا ایک اونٹنی سوار رشی

نبیؐ کے پیاروں کو عظمت نبیؐ کے در سے ملی　　　ہر ایک فضیلت و رفعت نبیؐ کے در سے ملی
نبیؐ سے پایا ابو بکرؓ نے جو صدق و یقیں　　　عمرؓ کو شانِ عدالت نبیؐ کے در سے ملی
غنیؓ حیا و سخاوت سے سر فراز ہوئے　　　علیؓ کو خوئے شجاعت نبیؐ کے در سے ملی
جو عائشہؓ کو تفقہ تو صبر زہراؓ کو　　　حسنؓ حسینؓ کو غیرت نبیؐ کے در سے ملی

نبیؐ کے عشق کا دل میں سرور باقی ہے
ہیں انؐ کے در کے گدا، یہ غرور باقی ہے

نبیؐ سے ہم کو محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں
مگر ثبوتِ اطاعت نہیں تو کچھ بھی نہیں
فقط زبان کا دعوائے عشق ناکافی
عمل سے اسکی شہادت نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہماری زیست کا آئین، زندگی کا نظام
اگر خدا کی شریعت نہیں تو کچھ بھی نہیں
عمل کا نام ہے اسلام جس کو کہتے ہیں
جو سامنے یہ حقیقت نہیں تو کچھ بھی نہیں

اگر ہم اب بھی نبیؐ کے غلام ہو جائیں
قسم خدا کی! جہاں کے امام ہو جائیں

سلام سید و سالارِ انبیاء پہ سلام
سلام مظہر انوارِ کبریا پہ سلام
سلام ساقئِ کوثرؐ، قسیم جنت پر
سلام طٰہٰ و یٰسین و مصطفٰے پہ سلام
سلام گنبد خضرا میں سونے والے پر
سلام ازل سے ابد تک کے رہنما پہ سلام
سلام گیسوئے مشکیں و روئے روشن پر
سلام معنئ و اللیل و الضحٰی پہ سلام

سلام اشعر!، مہجور اے صبا برساں
بذاتِ پاک نبیؐ ابروئے کون و مکاں

☆☆☆

یادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

مفتی محمد مصطفےٰ مفتاحی

عابد و معبود کا ہے رابطہ یادِ رسولؐ
درمیانِ کفر و ایماں فاصلہ یادِ رسولؐ

دلربا یادوں کا زرّیں سلسلہ یادِ رسول
ہے ازل سے تا ابد جلوہ فزا یادِ رسولؐ

کارساز و کارفرما ، کارگر ، کارِ خرد
کارزارِ زیست میں مشکل کشا یادِ رسولؐ

نقطۂ آغازِ گیتی ، نغمۂ تارِ حیات
محورِ ارض و سماء ، آبِ بقا یادِ رسولؐ

حسنِ علم و آگہی، حسنِ نظر، حسنِ کمال
زورِ بازو ، زورِ عزم و حوصلہ یادِ رسولؐ

زینتِ شام و سحر رنگِ چمن، تابِ نجوم
کارفرمائے جہانِ ماجرا یادِ رسولؐ

بادۂ وحدت کا کیفِ جاوداں، لطف و سرور
درحقیقت قبلے کا قبلہ نما یادِ رسولؐ

فکر کی بالیدگی ، ذوقِ سخن ، طورِ خیال
رونقِ بزم و بہارِ میکدہ یادِ رسولؐ

بے بدل دستورِ تعمیرِ نظامِ زندگی
شہپر جبریل و جانِ ارتقاء یادِ رسولؐ

اتحادِ ملتِ بیضاء ، رموزِ خسروری
ضامنِ امن و اماں ، بانگِ درا یادِ رسولؐ

ناخنِ تدبیر و درمانِ غم و رنج و محن
نسخۂ اکسیر دردِ لادوا یادِ رسولؐ

آبروئے علم و عرفان و ہنر ، نقد و نظر
ہے نقوشِ مصحفِ قدر و قضا یادِ رسولؐ

مصطفےٰ ! حاصل ، دوامِ عیش و گنجِ دو جہاں
گر نفس کی آمد و شد ہو سدا یادِ رسولؐ

جمالِ مصطفٰے

نعت بحضور سید البشر، فخرِ کائنات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم

ہے ناتواں مری فکر و نظر ترے آگے
اسیر ہیں یہ مرے بال و پر ترے آگے

تو حسنِ ذات ہے تیری کوئی مثال نہیں
ہے ذاتِ حسنِ ازل راہ بر ترے آگے

جہاں تجلیِ مولیٰ سے پر بھی جلتے ہیں
وہاں بھی سہل ہے راہِ سفر ترے آگے

وہ تیرا لطف کہ دشمن بھی مدعا اپنا
بیان کرتے تھے شام و سحر تیرے آگے

ستارے کرتے ہیں دن رات دل بری تیری
نثار ہوتے ہیں شمس و قمر ترے آگے

ترے وقار پہ صدقے ہے کہکشاں کی نظر
ہیں فرشِ راہ یہ جن و بشر ترے آگے

ترا جمال جسے دیکھنے کی تاب نہیں
جگر فگار ہے حیراں نظر ترے آگے

مآلِ کار قیامت کی وہ گھڑی ہوگی!
اگر نہ ہو سکے ہم بہرہ ور ترے آگے

خزاں ہو، موسمِ گل ہو، عروج ہو کہ زوال
ہوں جاں نثار ہم آٹھوں پہر ترے آگے

رِضا میں تیری ہے رب کی خوشی کا پروانہ
خدا کے فضل کا کھلتا ہے در ترے آگے

بصد خلوص تجھے بھی نصیب ہو مسرور
کہ جلد طیبہ کا اب ہو سفر ترے آگے

از سید مسرور احمد مسرور —— کتب خانہ دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد

اگر آج ہم اس بڑے امین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوتے تو ہم
خیانت و بددیانتی کا گزر نہ ہوتا، اگر آج ہم اس رؤف رحیم کے پیرو ہو
تو ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی جانب سے بے اعتمادی و بدگمانی نہ ہو
اگر آج ہم نے اس غارِ حرا کے بیٹھنے والے کے آثارِ مبارک کو اپنا سُرمہ چشم بنایا
ہمارے باطن میں کسی قسم کی گندگی باقی نہ رہ جاتی ـــــ اگر آج ہم فاتح بدر کی عظمت
سے کرنے والے ہوتے، تو مخالفین کے مقابلے میں، ہمیں شکستیں نصیب نہ ہوتیں ـــــ اگ
ہم رحمۃ للعالمینؐ کے پیام پر سچّے دل سے ایمان رکھتے ہوتے، تو اپنی جیسی مخلوقات
ساتھ ہمیں بے گانگی و مخالفت نہ ہوتی ـــــ اگر آج اپنے سچ بولنے والے اور سچ
برتنے والے نبیؐ کے طریقے پر ہم قائم ہوتے، تو جھوٹ کا ہماری آبادیوں میں نام و
ہی نہ ہوتا ـــــ اگر آج ہم کو اسمِ پاک احمدؐ کی لاج ہوتی تو اللہ کی حمد و ثنا سے ہم
اس قدر گریز نہ ہوتا ـــــ اگر آج ہم کو اسمِ گرامی محمدؐ سے عملاً کوئی واسطہ ہوتا
اپنی موجودہ پستی و بدنامی سے یہ مراحل دُور ہوتے ـــــ آج جبکہ سارے مُلک
میلادِ مبارک کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہوں گی ـــــ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان
ساتھ ساتھ ہم اپنے خلوت خانۂ قلب میں بھی کچھ دیر کے لیے ذکرِ پیمبرؐ و یادِ رسولؐ
محفل گرم کریں۔

(مولانا عبدالماجدؒ دریابادی)